حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی

گزشتہ ربع صدی میں

از

عبدالقادر سروری
ایم، اے۔ ال ال، بی
مددگار پروفیسر اردو
جامعۂ عثمانیہ۔ حیدرآباد دکن

مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس۔ چارمینار حیدرآباد دکن

تعداد طباعت (۵۰۰)

سنہ ۱۳۵۳ھ
۱۹۳۴ء

قیمت (۴؍)

ملنے کے پتے

۱۔ عبدالقادر تاجر کتب چارمینار حیدرآباد دکن

۲۔ مکتبہ ابراہیمیہ 〃 عابد روڈ 〃

فہرستِ عنوانات

صفحہ

تمہید

زمانہ قدیم اور قرونِ وسطی میں حیدرآباد دکن کی تعلیم کی حالت، اُس کی نوعیت نصاب اور طرزِ تعلیم غرض سب کچھ، ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ فرق صرف اِس قدر ہے کہ عہدِ وسطی میں، دکن میں چند مستقل، متمدن حکومتیں قائم ہو جانے کے سبب نیز دکن کی جغرافی خصوصیات کے نتیجہ کے طور پر یہاں نسبتاً زیادہ امن وامان کی زندگی میسر آسکی، اکثر حکمرانوں کی علم دوستی نے یہاں کچھ مستقل اور دیرپا اہمیت کے مدارس قائم ہونے میں سہولت پیدا کر دی تھی، گیارہویں صدی ہجری میں اُن سلطنتوں کی آپس کی چشمک نے علم وادب کی سرپرستی میں مسابقت کی صورت اختیار کر لی تھی۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ حیدرآباد میں مشرقی تعلیم کا دور دورہ زیادہ عرصہ تک رہا اور چونکہ مشرقی تعلیم کا عروج زیادہ روشن زمانے میں ہوا تھا، اِس لئے اس کے نتائج درخشاں ثابت ہوئے۔

[جدید، یعنے انگریزی تعلیم حیدرآباد میں باضابطہ طور پر ۱۸۵۵ء سے شروع ہوئی۔ یہی زمانہ عام تعلیم کی ابتدا کا ہے] اس سے پہلے تعلیم خاص طبقوں تک محدود تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کی تنظیم کا خیال، حکومت کو اس وقت سے پندرہ بیس سال پہلے ہو چکا تھا لیکن اس زمانے میں یہ کوشش فنی مدارس کے قائم کرنے تک محدود رہی اور عام تعلیم کی باضابطہ مہم سر سالار جنگ بہادر کے عہدۂ وزارت پر فائز ہونے سے پہلے شروع نہ ہو سکی۔

دارالعلوم کا قیام گزشتہ عہد کی تعلیمی تاریخ میں ایک عہد آفریں واقعہ ہے اس مدرسہ کی کامیابی نے، حکومت کے لئے اشاعت تعلیم کا کام آسان کر دیا۔ سر سالار جنگ مرحوم کو اس مدرسہ سے اس قدر دلچسپی تھی کہ مدار المہامی کے گران بار فرائض کے علاوہ، اس مدرسہ کے ساتھ تعلیم کا انتظام بھی انہوں نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ دارالعلوم میں طلبہ کی شرکت کی درخواستیں پہلے پہل نواب موصوف ہی کے پاس پیش ہوتی تھیں۔

۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۸ء تک اشاعت تعلیم کی ابتدائی کوششیں ہوتی رہیں اس دوران میں نہ صرف کئی سرکاری اور خانگی مدارس قائم ہوئے، بلکہ سررشتۂ تعلیم بھی باضابطہ طور پر تشکیل پایا۔ ۱۸۶۸ء کا زمانہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس زمانے سے تعلیم کی توسیع اور ترقی شروع ہوئی۔ مدرسہ دارالعلوم کو عروج ہوا۔ جامعۂ پنجاب سے الحاق کے پہلے یہ مدرسہ نہ صرف درس و تدریس کا ادارہ تھا بلکہ امتحانات کا

بھی یہ انتظام کرتا تھا۔ اس کی غیر معمولی کامیابی نے حکومت اور عوام کے ذہن میں حیدرآباد کے لئے ایک مشرقی جامعہ کے قیام کا خیال پیدا کر دیا تھا۔ یہ رفتار ترقی کم و بیش بیس پچیس سال تک قائم رہی۔ اس کے بعد سے اعلیٰ تعلیم پر ایک پستی طاری ہوئی جس کی اصلاح سنہ ۱۹۰۶ء کے بعد سے حکومت اور عوام کی تعلیمی مساعی کا محور بنی رہی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے حکومت سرکار عالی نے مسٹر ہیوا اور مولانا شبلی کا تقرر کیا تاکہ وہ تعلیم کے مروجہ نظامات اور نصاب وغیرہ کا بغور مطالعہ کر کے اصلاحی تجاویز پیش کریں۔ ان تجاویز کو روبراہ لانے کے لئے ڈاکٹر اللطیفی آئی، سی، یس، اور ان کے تحت بعض اور عہدہ داروں کی خدمات برطانوی ہند سے مستعار لی گئیں جن میں موجودہ ناظم صاحب تعلیمات خان فضل محمد خاں صاحب بھی شامل ہیں۔ اس تنظیم کا ایک فوری فائدہ یہ ہوا کہ تحتانی اور فوقانی تعلیم کی حالت اطمینان بخش ہو گئی۔ لیکن اعلیٰ تعلیم بدستور تنزل پذیر رہی۔ اس پستی کی وجہ سے ملک کے ذہنی قویٰ پر جو برا اثر پڑ رہا تھا، اس نے تعلیم یافتہ طبقہ کو چونکا دیا۔ اصلاح اور اشاعت تعلیم کے مقصد سے کئی انجمنیں قائم کی گئیں جن میں "ترقی تعلیم حیدرآباد" یا "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس دور کی وسیع ترین تحریک قیام جامعہ کا مطالبہ تھا۔

لیکن اعلیٰ تعلیم کی پستی کا حل اور جامعہ کا قیام اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی سریر آرائی کے بعد ہی ممکن ہو سکا۔ اعلیٰ حضرت کی توجہ سے سنہ ۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ قائم ہوئی اور ملک کے لئے ترقیوں کا دروازہ کھل گیا۔

اس تعلیمی ترقی کے مختلف دور کے قریبی سنین حسب ذیل ہیں۔

"تعلیم زمانۂ سابق میں" ۱۸۵۴ء سے پہلے تک ۔ اس سنہ میں پہلے پہل حکومت کو تنظیم تعلیم کا خیال پیدا ہوا ۔ اور چند مدرسے قائم کئے گئے ۔ "عام تعلیم کی طرح اندازی" کا زمانہ ۱۸۵۶ء سے ۱۸۸۰ء تک ہے ۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۵ء تک تعلیم مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگئی ۔ ۱۹۰۵ء کے بعد سے جامعۂ عثمانیہ کے قائم ہونے تک ایک درمیانی عبوری زمانہ ہے، جس کے ابتدائی سنین میں ، یعنے ۱۹۱۳ء تک اعلیٰ تعلیم کی حالت متنزل پذیر رہی ۔ ۱۹۱۳ء کے بعد سے اشاعت تعلیم ، اصلاح تعلیم اور قیام جامعہ کی تحریکیں مختلف گوشوں سے پیدا ہوتی رہیں ۔ بالآخر ۱۹۱۷ء میں جامعۂ عثمانیہ قائم ہوئی ۔

یہ اجمال ایک وسیع سرزمین ، اور ایک ہونہار قوم کے ذہنی نشو ونما کا خاکہ ہے اس کی تدوین ، سیاسی ، معاشرتی غرض دوسرے تمام تمدنی نظامات سے زیادہ ضروری ہے ۔ کیونکہ تعلیم ترقی تمدن کے تمام شعبوں کی ترقی کی اصل ہے ۔

اس موضوع پر اردو یا انگریزی زبان میں کوئی مستقل کتاب اب تک نہیں لکھی گئی ۔ ۱۸۸۲ء میں اس زمانے کے صدر المہام تعلیم ، اور مدار المہام کے ایماء سے ، مولوی سید حسین بلگرامی ، نواب عماد الملک مرحوم ناظم تعلیمات نے ، ممالک محروسہ سرکار عالی کی تعلیمی حالت کے متعلق ایک مفصل رپورٹ مرتب کی تھی ، جس کے ابتدائی صفحات میں اس زمانے کی تعلیمی ترقی کا خاکہ درج کیا ہے ۔ ۱۹۱۳ء میں دار العلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کے موقع پر "تاریخ دار العلوم" پر جو مضمون پڑھا گیا تھا اس میں جستہ جستہ اشارے گزشتہ زمانے

کی تعلیم سے متعلق موجود ہیں، مذکورۂ بالا تحریروں کے علاوہ، مولوی محمد مظہر صاحب نے
احیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے سالانہ اجلاس (منعقدہ ۱۹۱۵ء) میں تعلیم حیدرآباد کے
عنوان پر ایک مضمون پڑھا تھا، جس میں موصوف نے ابتدائی زمانے کے تعلیمی حالات،
اعداد و شمار، مصارف وغیرہ سے متعلق مفید معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اِن میں سے کوئی تحریر بھی
گزشتہ زمانے کے تعلیمی حالات اور موجودہ ترقیوں کی مکمل تاریخ نہیں ہے

اِس مختصر سی کتاب کے ذریعہ مرتب نے موجودہ زمانے میں حیدرآباد کی علم تعلیم کی
ترقی اس کی اشاعت اور توسیع کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ گزشتہ زمانے کی
تعلیمی تاریخ بھی بالاختصار بیان کی گئی ہے، اور ارتقائے تعلیم کے دور معین کئے گئے ہیں۔

آخر میں مرتب اوراق ہذا کو اُس مدد کا اعتراف کرنا ہے جو اُسے مختلف حضرات سے
ملی۔ یہ کام اِس قدر آسانی سے ممکن نہ ہو سکتا، اگر محترمی مولوی سید خورشید علی صاحب
ناظم دفتر دیوانی، ملکی و مال وغیرہ، فراہمی مواد وغیرہ میں مدد نہ فرماتے۔ جناب خان فضل محمد
خاں صاحب ناظم تعلیمات کا بھی مرتب ممنون ہے کہ موصوف نے اُس کی درخواست پر،
کتب خانہ دفتر تعلیمات سے استفادے کی اجازت عنایت فرمائی اور ممکنہ سہولتیں
بہم پہنچا دیں۔

عبدالقادر سروری

سلطان شاہی، حیدرآباد دکن
مورخہ ۲۱ شعبان ۱۳۵۲ھ

۱

تعلیم زمانۂ سابق میں

قدیم ترین محرکاتِ تعلیم ۔ قدیم تعلیم گاہوں کی نوعیت
تعلیم گاہوں کے طبقے ۔ "مدرسہ محمودیہ" (بیدر) بہمنی سلاطین
کے عہد میں تعلیم کی ترقی ۔ قطب شاہی اور عادل شاہی عہد
آصف جاہی زمانہ ۔ "مدرسہ عماروقیہ" (اورنگ آباد)
"مدرسۂ شجاعیہ" ۔ "مدرسہ فخریہ"

تعلیم زمانہ سابق میں

تعلیم کا اوّلین اور قدیم ترین محرک، ہر جگہ، مذہب رہا ہے۔ اور دُنیا کے اولین معلم، مقتدایانِ مذہب۔ عبادت گاہیں عموماً مدرسہ کا بھی کام دیتی تھیں اس کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ لوگوں میں مذہبی احکام سمجھنے کی بقدر ضرورت صلاحیت پیدا کی جائے۔ تاکہ مذہبی رسُوم کی بجا آوری میں سہولت ہو۔ متعلمین جنھوں نے اپنے آپ کو مذہب کے لئے وقف کر دیا، انہیں محض مذہبی احکام جاننے سے تسلی نہیں ہو سکتی تھی، بلکہ مذہبی احکامات کی تدوین، تزئین اور ان کے اصول کے استخراج کی انہیں ضرورت ہوئی۔ خصوصاً مذہب کو اغیار کے رُوبرو پیش کرنے اور اس کی معقولیت ثابت کرنے کے احساس نے، رفتہ رفتہ فلسفہ، کلام، منطق، سیر اور تاریخ کی بنیادیں اُستوار کیں۔

اسی سلسلہ میں صحائف مذہب کی زبان سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت نے زبان سے متعلق علوم جیسے قواعد، لغت اور بلاغت کی تدوین کا سبب بنی۔ اِس

آخری شعبۂ علم کی ترقی کا ایک اور زبردست محرک، شعر و سخن ہے۔ جس میں قومیں اپنے ارتقاء کے اولین مرحلوں سے محو ہو جاتی ہیں۔ مذکورۂ بالا اسباب کی بنا پر، یہ علوم مذہبی درسگاہوں کے نصاب میں جلد ہی داخل ہو گئے۔ رومیوں کے ہاں علم و زبان کے مدرسے، جو ابتدائی مدرسے تھے، علحدہ اور مستقل طور پر قائم ہونے لگے تھے۔ یہ "گرامر اسکول" یا مدارس بلاغت کے ناموں سے موسوم تھے۔ آج بھی وہ مدرسے جہاں زبان کی ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے "گرامر اسکول" ہی کہلاتے ہیں۔

عقول کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ اِن علوم کے شعبوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اور رفتہ رفتہ وہ تمام علوم مدوّن ہوئے جن کو مذہب کے ساتھ نزدیک یا دور غرض کسی طرح کا بھی تعلق تھا۔

جب زندگی کی وسیع اور گوناگوں مصروفیتوں نے مذہبی نصب العین کو علما کے سامنے سے دور ہٹا دیا تو یہ علوم تہذیب نفس کے لئے پڑھے اور پڑھائے جانے لگے۔

اسّی سال پہلے تک حیدرآباد دکن کی تعلیم اِسی نوعیت کی تھی۔ درس و تدریس انہیں مخصوص علمی شعبوں تک محدود تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں رعایا کو تعلیم دینا حکومت کا ایسا بھاری فرض نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مقتدایانِ مذہب اپنی عبادت گاہوں میں، خانقاہوں میں اور مکانوں میں درس و تدریس کا کام انجام دیا کرتے تھے۔ اُن کے مدارس کا نصاب اور نظام سب کچھ شخصی دلچسپی کے تابع تھا۔ حکومت کی طرف سے ایسے علما اور پنڈتوں کی امداد، اور بعض وقت

بیش بہا امداد کی جاتی تھی۔ وظیفے، یومیۓ، اور جاگیریں عطا ہوتیں تاکہ یہ کشتِ معشت کی کش مکش سے آزاد ہو کر، یکسوئی کے ساتھ درس وتدریس میں محو ہو جائیں بعض وقت اُمرا بھی اِس فرض میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ لیکن علم طور پر ایسے مدارس اور علماء کی پرورش عوام کی امداد سے ہوتی تھی۔ اُس زمانے کی تعلیمی حالت کا خاکہ نواب عماد الملک بہادر مرحوم سابق ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی نے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" (منعقدہ بہمن ۱۳۲۶ف) کے خطبۂ افتتاحیہ میں نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔

"ہنود کے زمانۂ حکومت میں کم کوئی ایسا قریہ ہوگا جس میں خود اہلِ دیہ کا بنا کردہ پاٹ شالہ موجود نہ ہو۔ اِن مدرسوں میں مزارعین اور اہلِ دیہ کے لڑکے ابتدائی تعلیم پاتے تھے، لکھنا پڑھنا اور ضروری حساب سیکھتے تھے اور سارا خرچ اُس کا خود گوارا کرتے تھے۔ اِس قسم کے پاٹ شالے جو اِس وقت تک بالکل معدوم نہیں ہوئے ہیں جا بجا اب بھی دیکھنے میں آتے ہیں، جن میں پٹیل پٹواری اور دوسرے گاؤں والوں کے لڑکے گوبر کی لپی ہوئی زمین پر بیٹھے ہوئے تاڑ کے پتوں پر یا خود زمین پر اپنی ملکی زبان کے حروف لکھ رہے ہیں یا پہاڑے یاد کر رہے ہیں۔

"اہلِ اسلام کے گھروں میں اِسی درجے کے مکتب جاری تھے۔ جن میں میاں جی صاحب لڑکوں کو اُردو فارسی نوشت وخواند سکھاتے تھے۔ قرآن

شریف پڑھاتے تھے۔ اور ضروری مذہبی ارکان سے اُن کو آشنا کرتے تھے[۱]۔

قدیم تعلیم گاہوں کے دو طبقات ہوتے تھے۔ ابتدائی تعلیم پاٹ شالوں اور مکتبوں میں پنڈتوں یا ملاؤں کے پاس ہوتی تھی۔ جہاں بچے رُومی گرامر اسکول کی طرح زبان کے محض ابتدائی درس لیتے اور لکھنا پڑھنا سیکھتے۔ شاید ہی کوئی قریہ اس طرح کی سادہ درسگاہوں سے خالی ہوتا ہوگا۔ بڑے شہروں میں تقریباً ہر محلے میں اس قسم کا ایک مدرسہ موجود ہوتا تھا جو تعلیم پانے والے طلبا کے سرپرستوں کی مدد سے قائم رہتا۔ اِن مدرسوں کے نظام کا کوئی ضابطہ بنا لینا مشکل ہے۔ تاہم چند امور عام ہیں۔ مثلاً طلبہ سے کوئی معین فیس نہیں لی جاتی تھی۔ غربا کے بچے عموماً مفت تعلیم پاتے۔ ہاں استاد کو اُن سے گھر کا کام لینے کا معنوی اختیار تھا۔ ضبط (Discipline) کے لحاظ سے آج کل کی شاید ہی کوئی درسگاہ اِن میں سے معمولی سے معمولی مدرسہ کا بھی مقابلہ کر سکے گی۔ اُستاد کا رتبہ باپ سے بھی زیادہ تھا۔ اُستادی اور شاگردی کے رشتے کی بنیاد اِس زمانے کی طرح، پیسے پر نہیں ہوتی تھی بلکہ اِس کا احترام روحانی رشتے کی طرح کیا جاتا تھا۔ طلبہ تو طلبہ اُن کے ماں باپ بھی استاد کی عزت بزرگوں کی طرح کرتے تھے۔ اِسی سماجی اہمیت کے سبب طلبا بغیر کسی معین امداد کی توقع کے اہل دیہ اور محلوں کے بچوں کی

۱۔ روئداد اجلاس سوم حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس۔ بمبئی ۱۹۱۸ء ۱۳۲۷ف صفحہ ۹۵

خدمت کرنے تیار ہو جاتے تھے۔ اُمرا کے لڑکوں کی تعلیم عموماً گھر پر اتالیق یا اتالیقہ کے ذریعہ ہوتی تھی۔

معمولی نوشت و خواند سے واقف ہونے کے بعد، جو متعلم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے، انھیں کسی مستند اور مشہور پنڈت یا عالم کی شاگردی اختیار کرنی پڑتی تھی۔ مسجدوں، مندروں، خانقاہوں میں، غرض جو بھی کسی عالم کی قیام گاہ ہوتی، علم و فن کا مرکز، کلیہ یا جامعہ بن جاتی تھی۔ یورپ کی بعض قدیم ترین جامعات ایسے ہی علماء کی قیام گاہوں سے اُٹھیں۔ مصر کی جامعۂ ازہر کا بھی یہی حال ہے۔ یہ گویا قدیم زمانہ کی اعلیٰ تعلیم گاہیں تھیں۔ ان میں درجہ بندی بہت کم ہوتی تھی۔ ہم درس طلبہ ہی جماعت بن جاتے۔ امتحان کا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا۔ مستند علماء کے نام ہی اُن کے شاگردوں کے لئے سند اور ڈگری کا حکم رکھتے تھے۔

پنڈتوں اور مُلّا صاحبوں کے ذاتی مدارس کے علاوہ بعض مدارس ایسے بھی قائم تھے جن کی کفیل حکومت ہوتی، یا اُمرا یا عوام اُس کی سرپرستی کرتے تھے، عوام کے مدرسے عموماً زود فنا تھے۔ یا پھر یہ زیادہ تر ابتدائی نوشت و خواند کے مدرسے ہوتے تھے، اِسی لئے اِن کی اہمیت ناقابلِ اعتنا سمجھی جاتی تھی۔ حکومت اور اُمرا کے قائم کردہ مدارس کا پتہ اسلامی حکومت دکن کے ابتدائی دور سے چلتا ہے۔ ولمٹ اِسی زمانے کے مدارس کے متعلق رقمطراز ہے کہ:-

"اِن مدرسوں اور کالجوں میں، جن میں سے اکثر، سلاطین بہمنیہ کے قائم کردہ تھے یا اُن کی امداد سے چلتے تھے، طلبہ کی رہایش کا بھی انتظام تھا اور اُن کے کھانے پینے اور لباس کے اخراجات سب کچھ حکومت برداشت کرتی تھی[1]۔" اِن مدارس کی تعلیم کے متعلق وہ لکھتا ہے: "ممالکِ محروسہ میں قدیم ترین نظام تعلیم جو رائج تھا، عموماً بہت ہی سادہ سیدھا اور اُس زمانے کی ضرورت کے مطابق تھا۔"

ابتدائی مدرسوں میں لکھنا پڑھنا، حساب اور مذہبی کتابوں کے آسان سبق پڑھائے جاتے تھے۔ اعلیٰ مدارس میں مذہبی علوم تحقیق و تدقیق کے ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔ ابتدائی درجے کے مدارس گو تعداد میں بے شمار ہوتے تھے لیکن اِس زمانے میں اُن کے حالات کا بہت کم پتہ چل سکتا ہے۔ عموماً اعلیٰ مدارس کا تذکرہ تواریخ میں موجود ہے، جن میں "مدرسہ محمودیہ" دکن کی علمی تاریخ میں بہت شہرت رکھتا ہے۔

"مدرسۂ محمودیہ" کا بانی سلطان محمد شاہ ثالث (۸۶۷ھ تا ۸۸۷ھ) کا علم دوست وزیر اور مدبر، خواجہ عماد الدین تھا، جو محمود گاواں کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ مدرسہ ۱۴۷۲ء (م ۸۷۶ھ) میں بہمنیوں کے آخری پایۂ تخت، شہر بیدر میں بہ صرف کثیر تیار کیا گیا تھا۔ حادثاتِ زمانہ سے اِس کا ایک حصہ

---

[1] "ہسٹاریکل اینڈ ڈسکرپٹیو اسکیچ آف ہز ہائینس دی نظامس ڈومینین" ۱۸۸۴ء صفحہ ۲۰۵

خراب ہوگیا ہے، لیکن جس قدر عمارت اب بھی باقی رہ گئی ہے، اُس سے مدرسہ کی قدیم عظمت کا بہت کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ یہ عمارت چونتیس ہزار مربع فٹ پر نہایت سلیقے سے بنائی گئی تھی۔ روکار کی طرف دو اونچے مینار تھے جن کی بلندی (۱۹۰) فٹ تھی۔ ان میں سے ایک مینار اب بھی باقی ہے، عمارت تین منزلہ ہے، اور کئی وسیع اور ہوادار کمروں اور دالانوں پر مشتمل۔ یہ کمرے اور دالان اس زمانے میں طلبہ اور اساتذہ کی قیام گاہ تھے۔

اکنافِ ہند کے بہترین علما یہاں درس دینے کے لئے جمع کئے گئے تھے بیرونِ ہند کے شہرۂ آفاق علمار جیسے مُلّا نورالدین جامی، محمدؐ جمال الدین دوانی وغیرہ کو بھی بانیٔ مدرسہ نے یہاں آنے کی دعوت دی تھی لیکن یہ بزرگوار، یہاں تشریف نہ لاسکے۔ شیخ ابراہیم ملتانی، جو اکثر سلاطین بہمنیہ کے اُستاد رہ چکے ہیں اِس مدرسہ کے صدر تھے۔

اِس اہتمام کے ساتھ جو درسگاہ قائم ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ اُس کا شہرہ اپنے زمانے میں دور دراز ممالک تک پہنچ چکا تھا۔ اطرافِ ہند سے تشنگانِ علم یہاں آتے اور اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے۔

سلاطین بہمنیہ کے بعد، جب سلطنت دکن کے حصّے بخرے ہوگئے، تو دکن کی تعلیمی مرکزیت کچھ عرصہ کے لئے ختم ہوگئی۔ اِس میں شک نہیں کہ اُس زمانے میں ایک اچھے عالم کے مقابلے میں ایک اچھے سپاہی کی زیادہ اہمیت

تھی، پھر بھی بیدر کے بریدشاہیہ اور گولکنڈہ کے قطب شاہیہ حکمرانوں نے علم وادب کی بڑی سرپرستی کی۔ اس عہد میں بھی بہت سی درسگاہیں حکومت کی امداد سے قائم تھیں، لیکن تعلیمی حیثیت سے "مدرسۂ محمودیہ" کی سی مرکزیت اُن میں سے شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہوگی۔ قطب شاہی عہد کے بہت سے ایسے مدارس کا آج بھی پتہ چلتا ہے جو مزاروں، خانقاہوں اور مسجدوں سے متعلق تھے اور جہاں مذہبی طرز کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ چار مینار کا مدرسہ ان حکمرانوں کی تعلیمی سرپرستی کا ثبوت دینے کے لئے وسطِ شہر میں آج بھی باقی ہے۔[1]

آصف جاہی خاندان کے اولین تاجداروں کی توجہ تمامتر بیرونی جنگوں کے سرانجام اور اندرونی نظم ونسق کی درستی میں الجھی رہی، تاہم اُن کے دماغ ملک کی تعلیمی ضرورت کے خیال سے خالی نہیں تھے۔ اورنگ آباد میں آصف جاہِ اوّل کے قائم کئے ہوئے "مدرسۂ فاروقیہ" کا نام آج تک باقی ہے جو عرصہ تک تشنگانِ علم کو سیراب کرتا رہا۔

خاص شہر حیدرآباد کی جامع مسجد میں ایک مدرسہ قائم تھا۔[1] جو اُس کے روحِ رواں مولانا حافظ شجاع الدین کے نام پر "مدرسہ شجاعیہ" کہلاتا تھا۔ جامع مسجد کا یہ مدرسہ درحقیقت بہت قدیم ہے، اِس کی تعمیر، مسجد کے ساتھ،

---

[1] ہسٹاریکل اینڈ ڈسکرپٹیو اسکیچ آف ہز ہائنس دی نظامس ڈومی نین۔ سائنڈولٹ و سید حسین بلگرامی صفحہ ۲۰۷

سلطان محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ۔ ۱۰۲۰ھ) کے عہد میں ہوئی تھی تعلیم کے علاوہ طلبہ کے رہنے سہنے کے لئے بھی اس میں کمرے بنے ہوئے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہاں تعلیم و تعلم کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ حضرت ناصر الدولہ بہادر کے عہد تک (۱۲۴۴ھ ۱۸۲۹ء م ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء) تو اس کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ مغل صاحب، جن کی دیوڑھی جامع مسجد کے رُوبرو واقع ہے، مسجد کے صحن میں اپنا ہاتھی باندھا کرتے تھے۔ اور مدرسہ کے کمرے، ہاتھی کا سامان اور چارہ رکھنے کے کام آتے تھے۔ حافظ صاحب باوجود اپنے کمالاتِ باطنی اور مہارت علمی کے، پہلے پہل مدرسہ کے ایک کمرے میں فروکش تھے اور یہیں طالبان علم کو درس دیا کرتے تھے۔ آپ کے فیض کا شہرہ جب تمام شہر میں پھیل گیا تو نواب شمس الامرا بہادر کو بھی آپ سے عقیدت ہو گئی۔ آپ مہاراجہ چندو لعل کے ساتھ، مولانا سے ملنے گئے، مسجد اور اُس کے متعلقات کی یہ گت دیکھ کر مغل صاحب کو اُس کے فوراً صاف کرنے کا حکم دیا۔ اور اپنے صرفہ سے مولانا کے قیام اور درس و تدریس کے لئے کمرے بنوا دئے۔ یہ ۱۸۳۰ء کا ذکر ہے۔ اس کے بعد سے "مدرسہ شجاعیہ" کو خوب شہرت ہوئی اور اطراف و اکناف سے تشنگان علم، یہاں جمع ہونے لگے۔ مولانا نے مدرسہ کے طلبہ کے

لہ "مناقب شجاعیہ" مولفہ محمد امیر اللہ فاروقی دکنی ۱۳۰۱ھ۔ صفحہ ۵۸ و ۵۹

لئے کئی رسالے فارسی اور اُردو میں تصنیف فرمائے تھے، جن میں سے کشف الکلام ہندی، کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ دینی مسائل پر ایک منظوم رسالہ ہے جو حال تک بھی مدارس سرکار عالی کے نصاب دینیات میں شامل تھا۔

حضرت ناصر الدولہ بہادر کے عہد میں، ریاست کے تعلیمی نظام کی جدید ترمیم او رتنظیم سے پہلے، ایک نا قابل فراموش درس گاہ کا ذکر اور باقی رہ جاتا ہے۔ یہ برگزیدہ درس گاہ "مدرسۂ فخریہ" ہے اِس کے بانی مبانی، حیدرآباد کے مشہور عالم وفاضل، امیر کبیر نواب محمد فخرالدین خاں شمس الامرا ثانی ہیں۔ نواب صاحب موصوف کو عقلی اور حکمی علوم سے عدیم المثال دلچسپی تھی۔ آپ کا مطالعہ نہایت وسیع اور آپ کا علم حاضر تھا۔ اِسی علمی شغف کے باعث ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں نواب صاحب موصوف نے اپنی ڈیوڑھی واقع شاہ گنج میں ایک مدرسہ علوم نقلیہ او رعقلیہ کی تعلیم کے لئے قائم فرمایا۔ اس میں ملک کے مستند علما تعلیم دینے کے لئے ملازم رکھے گئے تھے۔ اُس زمانے میں نہ صرف حیدرآباد، بلکہ ہندوستان بھر میں یہ اپنی نوعیت کا ایک مدرسہ تھا، جہاں متداولہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ حکمی اور عملی علوم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اُردو میں اِن علوم کی کتابیں موجود نہ ہونے کی وجہ سے، خود بانیٔ مدرسہ، کتابیں تصنیف کرتے اور دُوسرے علماء سے لکھواتے تھے۔ یہ کتابیں عموماً خود نواب صاحب موصوف کے مطبع میں چھاپی جاتیں۔ اور نہ صرف مدرسۂ فخریہ"

بلکہ کے شہر تمام طلبہ میں مفت تقسیم کی جاتیں۔ نواب صاحب نے ہیئت کی عملی تعلیم اور اجرام فلکی کے مشاہدات کے لئے، جہاں نما، کی عمارتیں بھی تعمیر کرائی تھیں، جو آج تک باقی ہیں اور اپنے بنا کرنے والے کی علمی دلچسپی کی گواہی دے رہی ہیں۔

مولانا امام خاں، مرتب "تاریخ خورشید جاہی" کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے اِس مدرسے کے علاوہ چند اور درسگاہیں بھی قائم کی تھیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"سنہ ۱۲۵۸ ہجری میں ایک اور متعدد مکتب قرار دئے۔ اور وجہ کفاف معلم و متعلم کا ذمہ سرکار کے، اطفال بلد کو واسطے تحصیل علوم کے، اہتمام سے سید عبدالرزاق اہل قرابت فتح الدولہ اور محمد جعفر دار وغہ کتب خانہ کے مامور فرمائے۔ چنانچہ ہنوز چار سے اٹھائیس (۲۸) لڑکے ذہین اور کئی طلبہ درپئے تحصیل علم و سرگرم نوشت و خواند ہیں[1]"۔

صاحب "بستان آصفیہ" نے اِس مدرسہ سے متعلق نہایت دلچسپ امور بیان کئے ہیں:-

"نواب فخرالدین خاں شمس الامرا ثانی نے غریب بچوں کی تعلیم کے

---

[1] تاریخ خورشید جاہی مطبوعہ مطبع خورشیدیہ سنہ ۱۲۰۶ھ صفحہ ۵۸۵

لئے ۱۲۵۷ھ م ۱۸۵۳ء میں اپنی ڈیوڑھی کے اندر مدرسہ قائم کیا اور ہر غریب بچے کو بغرض تحریص و ترغیب ہر پندرھویں روز ایک چوانی مقرر کی۔[1]

نواب صاحب موصوف کے انہیں علمی اور تعلیمی کارناموں نے اُن کی ذات کو اپنے زمانے کی نہایت اہم شخصیت بنا دی تھی۔ اِن کا نام حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

بانیٔ مدرسہ کے جانشین امرانے بھی اِس مدرسہ کو فروغ دینے کی بے حد اور خاطر خواہ کوشش کی۔ انھیں علم پروریوں کا نتیجہ ہے کہ "مدرسۂ فخریہ" گزشتہ سو سال سے قائم ہے اور اپنے عروج و زوال کی داستان سنانے کے لئے آج تک بھی زندہ ہے۔

[1] "بستانِ آصفیہ" حصہ اول صفحہ ۳۴۷

۲

عام تعلیم کی طرح اندازی

تنظیم تعلیم کی اولین کوشش ۔ مدرسہ طبابت (بلدہ) ۔ مدرسۂ دار العلوم ۔ تعلیم کی توسیع اضلاع تک ۔ مدارس اضلاع ۔ محکمۂ مال اور تعلیم ۔ مدار المہامی تعلیم کا قیام ۔ محکمۂ مال کے اثر کا زوال ۔ معتمد تعلیم کا تقرر ۔ مسٹر ولکنسن کی تجویز ۔ مولوی عنایت الرحمٰن خاں کی تنظیمات ۔ اسمات کا قیام ۔ اطراف بلدہ کے مدارس ۔ "مدرسۂ عالیہ" ۔ "مدرسۂ نظامیہ" دیگر خصوصی اور خانگی مدارس ۔

عام تعلیم کی طرح اندازی

آصف جاہ رابع، حضرت غفران منزل نواب ناصر الدولہ بہادر کے عہد (۱۸۲۷ء/۱۲۴۴ھ تا ۱۸۵۶ء/۱۲۷۲ھ) تک برطانوی ہند میں تعلیم کے دو دور گزر چکے تھے پہلا دور مشرقی تعلیم کا، جو ۱۷۸۱ء سے شروع ہوا، اور جس کا مرکز ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر مقام کلکتہ تھا۔ دوسرا دور ۱۸۳۵ء کے بعد کا ہے، جس میں لارڈ میکالے کی تجویز پر عمل شروع ہوا۔ اور بجائے السنہ مشرقی کے، انگریزی تعلیم کا رواج ہوا۔ حیدرآباد اطراف کی تعلیمی تحریکات سے مستغنی نہیں رہ سکتا تھا۔ برطانوی ہند کے تجربے عموماً اُن کی کامیابی اور ناکامیابی کی یکسوئی کے بعد ممالک محروسہ میں اختیار کئے جاتے رہے۔ حکومت کی یہ قدامت پسندی، نقصانات بھی رکھتی ہے، اور فوائد بھی۔ اِس کی وجہ سے اِس میں شک نہیں کہ حیدرآباد تعلیمی دوڑ میں برطانوی ہند سے پہلے پہل کچھ پیچھے پڑ گیا تھا، لیکن تجربوں کو قبل از وقت اختیار کر کے ناکامی کی صورت دیکھنا اُسے نصیب نہ ہوا۔

حضرت غفراں منزل نواب ناصر الدولہ بہادر کی سر پرآرائی کے آخری زمانے سے حیدرآباد میں تنظیم تعلیم کی کوششیں شروع ہوئیں، اور سب سے پہلے، دارالسلطنت میں، مدرسہ طبابت قائم کیا گیا (۱۸۴۵ء) اِس مدرسہ میں ڈاکٹری کی تعلیم اُردو زبان میں دی جاتی تھی۔ یہ سب سے پہلا مدرسہ ہے جس کی کفیل حکومت انھیں معنوں میں تھی، جن معنوں میں، آج کل کی کوئی مہذب حکومت کسی مدرسہ کی کفیل ہوسکتی ہے۔ یہ مدرسۂ طبابت عرصہ دراز تک قائم رہا۔ اور یہاں سے بعض ایسے قابل ڈاکٹر پیدا ہوئے جن کے کارنامے آج بھی حیرت کی نگاہ سے دیکھے جارہے ہیں۔ نواب لقمان الدولہ بہادر جو اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن کے طبیب خاص تھے، اِسی مدرسہ کے تربیت یافتہ تھے۔ جو لوگ نواب لقمان الدولہ بہادر سے واقف ہیں وہ اس امر کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ نواب صاحب کی معلومات فن طب میں کس قدر وسیع تھیں۔ آئے دن یورپ میں اِس فن کو جو ترقیاں ہوتی تھیں اُن سے اپنے کو واقف رکھنے کا موصوف نے خاص طور پر انتظام کیا تھا۔ دواخانۂ عثمانیہ افضل گنج کے سابق مہتمم ڈاکٹر ارسطو یار جنگ بہادر، جو بفضل خدا اب بھی بقید حیات ہیں، اور جن کے معالجات سے ہزارہا مخلوق مستفید ہوتی رہتی ہے، اِسی درسگاہ کے فارغ التحصیل ہیں۔

اِس درسگاہ کے قیام کے دس سال بعد، حضرت غفراں منزل کی مردم شناس نگاہوں نے ایک جوہر قابل کو ڈھونڈھ کر نکالا اور قلمدانِ وزارت اُس کے

حوالے کرکے، عملاً تمام سیہ وسفید کا مالک بنا دیا۔ یہ اُس عصر کی بہترین پیداوار سر سالار جنگ بہادر ہیں جو اپنے چچا کے بعد ۱۸۵۳ء میں ریاستِ دکن کی مسند وزارت پر متمکن ہوئے۔ نواب سر سالار جنگ بہادر اپنے عصر کی ضرورتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ مدار المہامی کے عہدے پر فائز ہونے کے دوسرے ہی سال آپ کو ملک کی تعلیمی پستی کا احساس ہوا۔ اور اہل ملک کو تعلیم دینے کے لئے آپ نے پایہ تخت میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جو مدرسۂ دار العلوم کے نام سے موسوم ہوا۔ اور چونسٹھ[1] سال تک ملک میں علم کی روشنی پھیلاتا رہا۔

۲۰ رجب ۱۲۷۲ھ م ۸ مارچ ۱۸۵۶ء کو پتھر گٹی پر، نواب صاحب ہی کے مکان میں، اِس نئی درسگاہ کا افتتاح ہوا۔ اور ایک سو تیس طلبہ سے تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ اِس میں شک نہیں کہ اُس زمانے میں یہ تعداد ہمت افزا تھی، لیکن پھر بھی اس کی ابتدا پر نظر کرتے شاید ہی کسی کو اِس کا یقین آسکتا ہوگا کہ اِس کے موسسین کی یہ تمنا کہ حیدرآباد ایک مشرقی جامعہ کا مستقر اور علومِ مشرقی کا مرکز بنا رہے، بدرجۂ اتم پوری ہوگی۔

دار العلوم کا قیام، حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں تنظیم تعلیم کا پہلا، اور مستقل قدم ہے، قائم ہونے کے دو، تین سال کے اندر اندر اِس درسگاہ نے

---

[1] رپورٹ نظم و نسق سررشتہ تعلیمات بابتہ ۱۳۲۲ف م ۱۹۱۳ء صفحہ (۲۹)

ایک جامعہ کی شکل اختیار کر لی۔ اس مدرسہ کے انتظامات اور نگرانی کے لیے جو جو مجلس قائم ہوئی تھی، وہ درحقیقت محکمۂ تعلیم کا مقدمہ سمجھی جانی چاہیئے۔

چار سال یعنے ۱۸۵۹ء ۱۲۶۸ف تک اس درسگاہ کی حیثیت ایک معمولی مگر زندہ مدرسہ کی رہی۔ اس کے بعد یہ مدرسہ ایک جامعہ کی شکل اختیار کرتا گیا اور رفتہ رفتہ ایک تناور درخت بن کر اپنی شاخیں اس نے اضلاع اور تعلقات تک پھیلانی شروع کیں۔

مدرسہ کا اوّلین نظام تعلیم کم و بیش وہی تھا جو، عام طور سے اسلامی ممالک میں " درسِ نظامیہ "کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن ابتداہی سے اس مدرسہ میں زمانہ کی ضرورتوں کا کچھ نہ کچھ خیال ضرور رکھا گیا تھا۔ چنانچہ انگریزی کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کی تعلیم کا بھی یہاں انتظام تھا۔ حساب اور اقلیدس کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ تعلیم کا ذریعہ اُردو زبان تھی۔ انگریزی اور السنۂ مقامی کی شاخیں علیحدہ علیحدہ تھیں۔ موجودہ سٹی کالج، مدرسۂ دارالعلوم کی انگریزی شاخ ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

دارالسلطنت میں جب مدرسۂ دارالعلوم کامیابی کے ساتھ قدم آگے بڑھانے لگا تو اضلاع اور تعلقات میں بھی تعلیم کا شوق پیدا ہوا اور اہالیانِ ضلع اور تعلقات کی طرف سے مدارس کھولنے کے لئے محکمۂ مال میں درخواستیں گزرنے لگیں آخر کار سنہ ۱۸۶۰ء م سنہ ۱۲۶۹ف میں ایک گشتی نافذ ہوئی جس کی رو سے ہر تعلقہ

میں دو دو مدرسے کھولے جانے شروع ہوئے۔ اِن مدارس میں سے ایک مدرسہ فارسی اور دوسرا مقامی زبان کا ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ دفتری اور سرکاری زبان اب تک رسماً فارسی تھی، اِس لئے عموماً لوگ اپنے بچوں کو فارسی مدارس میں بھیجنا زیادہ پسند کرتے تھے، چنانچہ قدیم رپورٹوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی مدارس کی تعداد مقامی زبانوں کے مدرسوں کی تعداد کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ ہوتی تھی۔

تعلقات کے مدرسے ابتدائی تعلیم دیا کرتے تھے۔ مگر مدارس اضلاع کے نصاب میں قدیم کتب کے علاوہ ریاضی، حساب، قواعد، تاریخ اور جغرافیہ بھی شریک تھے۔ ان مدارس کی نگرانی تمام و کمال عہدہ داران مال کرتے تھے، گویا اُس زمانے میں اضلاع کی تعلیم محکمۂ مال کے تحت تھی۔ یہ انتظام ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۷۸ھ تک برابر قائم رہا۔

۱۸۵۶ء سے لیکر ۱۸۶۹ء تک عام تعلیم کی تنظیم اور توسیع کی اولین کوششیں ہوتی رہیں۔ اِس چودہ سال کے عرصہ میں دارالسلطنت اور اضلاع میں درحقیقت عام تعلیم کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ بلدہ میں اُس زمانے کے قابل ترین اشخاص کے زیر اہتمام ایک مرکزی درسگاہ پانچ شاخوں کے ساتھ، جو شہر کے ابواب میں تھے مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگئی۔ ایک تعلیمی مجلس بنی۔ اور اضلاع میں سے تقریباً تمام ضلعوں میں اور تعلقات میں فارسی اور مقامی زبانوں کے مدارس قائم ہوگئے

بلدہ کی مرکزی درسگاہ میں انگریزی تعلیم کی بھی ابتدا ہوئی۔

۱۸۶۹ء ۱۲۷۸ف تک حکومت مذکورۂ بالا نتائج کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کے بعد اُس نے گزشتہ حالات پر نظر تنقید ڈالنی شروع کی۔ مالی عہدہ داروں سے، اپنے دفتری کاروبار کے علاوہ تعلیم و تدریس کی جس قدر نگرانی ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔ یہ اولین انتظام تھا، اس میں خرابیوں کا پایا جانا، ناگزیر ہے۔ غالباً انہیں اُمور کے مدِنظر حکومت نے داخلی اُمور (جن میں تعلیمات بھی داخل ہے) کے نظم و نسق کے لئے ایک صدر المہام کا تقرر منظور کیا۔ اور محکمۂ مال کے نام احکام جاری ہوئے جس کے بموجب اساتذہ کا تقرر، تعطل، مدارس کی عام نگرانی، غرض تعلیمی معاملات کو نئے صدر المہام کے سپرد کرنے کی ہدایت کی گئی۔ صرف ادنی ملازمین جیسے چپراسی، فراش، وغیرہ کی نگرانی صدر تعلقدار کے سپرد تھی۔

اس نئے انتظام سے عہدہ داران مال کی مداخلت تعلیمی معاملات میں بہت کم ہوگئی۔

صدر المہام کے تقرر کے دوسرے ہی سال، ایک ایسے معتمد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جو تعلیمات کے کاروبار کو اپنی نگرانی میں لے سکے۔ اس خدمت کے اہل اُس زمانے میں مدرسۂ انجنیری کے صدر مسٹر ڈبلیو، ایچ ولکنسن متصور ہوئے۔ جنھوں نے ایک مہتمم تعلیم السنۂ مقامی کی مدد سے بلدہ اور اضلاع کے

پورے تعلیمی انتظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

مسٹر ولکنسن کے تقرر کے وقت، کہا جاتا ہے کہ اضلاع میں کل مدارس کی تعداد[1] (۱۲۵) تھی معتمد نے سب سے پہلے دار العلوم اور اس کی شاخوں کی اصلاح کرنی چاہی پہلے پہل اُن کا منشاء مذکورۂ بالا چھ مدارس کو شہر کے چھ ابواب خلصہ پر قائم کرنے کا تھا۔ لیکن موزوں جگہ نہ ملنے کے سبب ایک ہی عمارت میں حسب ذیل چھ مدرسے علیحدہ علیحدہ قائم کئے گئے۔

(۱) مدرسۂ قرآن شریف (۲) مدرسۂ فوقانیہ عربی (۳) مدرسۂ فوقانیہ فارسی (۴) مدرسۂ زبان مقامی نمبر ۱ (۵) مدرسۂ زبان مقامی نمبر ۲ (۶) مدرسۂ فوقانیہ انگریزی[2]۔

مسٹر ولکنسن کے ذہن میں تعلیم کی اشاعت کا کوئی خاکہ بننے بھی نہ پایا تھا کہ سنہ ۱۸۷۲ء (۱۲۸۱ف) میں تعمیرات عامہ کا کام اُن کے سپرد ہوا اور وہ صدر المہام ہو کر چلے گئے لیکن جانے سے پہلے انھوں نے اساتذہ کی تربیت کے لئے ایک مدرسۂ تعلیم المعلمین کا خاکہ مرتب کیا اور چادرگھاٹ میں ایک مدرسہ فوقانیہ انگریزی قائم کیا۔ مدرسۂ تعلیم المعلمین کے قائم کرنے اور اس کے ساتھ سررشتۂ تعلیم کو منظم کرنے کا بار مسٹر ولکنسن کے مددگار مولوی عنایت الرحمن خاں، مہتمم السنہ مقامی کے سر پڑا، جو مسٹر ولکنسن کے بعد، اُن کے جانشین مقرر ہوئے۔

---

[1] ہسٹری آف دی ایجوکیشنل ڈپارٹمنٹ مرتبہ نواب عماد الملک مؤتمن جنگ سید حسین بلگرامی معتمد تعلیمات [illegible]

مولوی عنایت الرحمٰن خاں بارہ سال تک نظامت تعلیمات کی خدمت پر مامور رہے۔ ایک ربع صدی کی تعلیمی تاریخ اُن کے پیش نظر تھی اور مسٹر ولکنسن کے مددگار کی حیثیت سے وہ سررشتۂ تعلیم کا تجربہ بھی حاصل کر چکے تھے، اس لئے انہیں اپنے پیش رو سے زیادہ تعمیری کام کرنے کے مواقع حاصل تھے، جن سے عہدہ دار مذکور نے کماحقہٗ فائدہ اٹھایا۔ سررشتۂ تعلیم کی تشکیل کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ تعلیمی اعداد شمار کی بھی اُسی زمانے سے ابتدا ہوئی۔ نظم و نسق تعلیم کی کیفیتیں مرتب ہونے لگیں اور مدارس اور اساتذہ سے متعلق قواعد و ضوابط منضبط ہوئے۔

اضلاع کے مدارس اور تعلیم کی نگرانی کے لئے ایک نظام بھی اُسی زمانے میں بنایا گیا۔ کل مدارسِ اضلاع پانچ حلقوں پر منقسم کئے گئے۔ یہ حلقے اسمات کے نام سے موسوم تھے سمتِ شمالی، سمتِ جنوبی، سمتِ مشرقی، سمتِ مغربی، اور سمتِ شمال مغربی۔ بلدہ کے سرکاری مدارس راست ناظم کی نگرانی میں تھے۔

جس وقت مولوی عنایت الرحمٰن خاں نے معتمدی اور نظامت تعلیمات کا جائزہ مسٹر ولکنسن سے لیا، بلدہ اور اضلاع کے کل مدارس کی تعداد ۱۳۹ تھی اور ان مدارس میں ۵۰۶۵ طلبہ زیر تعلیم تھے۔ سالانہ تعلیمی مصارف ـ (۱۴۳۴۹۲) روپیہ تھے۔

بلدہ اور اطراف بلدہ میں حسب ذیل مدارس قائم تھے :-

حدود بلدہ میں مدرسہ دارالعلوم اپنی چھ شاخوں کے ساتھ قائم تھا۔

جن میں مدرسۂ فوقانیہ انگریزی بلدہ بھی شامل ہے۔ حدودِ چادر گھاٹ میں مدرسۂ فوقانیہ چادر گھاٹ اشاعت تعلیم میں مصروف تھا۔ یہ تمام مدارس ناظم تعلیمات کی نگرانی میں تھے۔

اطراف بلدہ میں حسب ذیل مدارس تھے جن کی نگرانی کے لئے انتظامی مجلسیں قائم تھیں۔

(۱) محبوب کالج سکندر آباد (۲) وسلین اسکول (۳) محمڈن کالج (۴) گرلس پاٹ شالہ (۵) گرامر اسکول، بلارم (۶) گرلس اسکول، بلارم (۷) سینٹ جارجز گرامر اسکول (۸) رومن کیتھولک مشن اسکول (۹) ایس، پی، جی اسکول، (۱۰) رزیڈنسی اینگلو ورناکیولر اسکول۔ (۱۱) مدرسہ عالیہ۔

مدرسۂ عالیہ، جو امرا کی تعلیم کے لئے مخصوص تھا۔ اپنی ایک دلچسپ تاریخ رکھتا ہے۔ یہ مدرسہ پہلے پہل نواب سر سالار جنگ بہادر کی دیوڑھی میں، خانگی جماعت کی حیثیت رکھتا تھا جس میں نواب صاحب موصوف کے فرزند اور اعزہ تعلیم پاتے تھے تعلیم بالکل مغربی وضع کی تھی کیمبرج کے ایک طیلسانی مسٹر پرتل، اپنے ایک انگریز مددگار کے ساتھ، اس کی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار تھے، نواب میر لایق علی خاں سالار جنگ ثانی، نواب میر سعادت علی خاں، منیر الملک، مہاراجہ یمین السلطنتہ سر کشن پرشاد بہادر اور راجہ مرلی منوہر، آصف نواز ونت بہادر، اس مدرسہ کے ابتدائی طالب علموں میں سے

ہیں۔ ملک کے بعض امراء بھی اپنی اولاد کو یہاں پڑھانے کے خواہش مند تھے جب مدارالمہام نے ۱۸۷۳ء میں اس جماعت کو مدرسہ کی شکل میں تبدیل کرکے، ریمونڈ کی کوٹھی، واقع چادر گھاٹ میں منتقل کردیا۔ ۱۸۸۱ء (۱۲۹۰ ف) میں مسٹر حسن اس کے صدر مقرر ہوئے۔ اور مدرسہ روز افزوں ترقی کرنے لگا۔ ۱۸۸۴ء (۱۲۹۴ ف) تک طلبہ کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی کہ، مدرسہ کے لئے ایک جدید عمارت تیار کرنی پڑی حیدرآباد کے اکثر امراء، جو اس وقت بھی بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں، اسی مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہیں۔

اس مدرسہ میں تعلیم کے دو شعبے تھے، ایک انگریزی، دوسرا مشرقی۔ انگریزی شعبے میں، انگریزی، لاطینی، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور سائنس کی تعلیم ہوتی تھی شعبہ مشرقی کا نصاب عربی، فارسی، اردو اور مقامی زبانوں پر مشتمل تھا۔ ہر طالب علم کو دونوں شعبوں کے مضامین پڑھنے پڑتے تھے۔ کنڈر گارٹن کا نظام تعلیم، سب سے پہلے اسی مدرسہ میں جاری ہوا (۱۸۸۱ء، ۱۲۹۰ ف) سیول سروس کی جماعت بھی سب سے پہلے اسی مدرسہ میں قائم کی گئی تھی (۱۸۸۳ء)۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ امراء کی تعلیم پر خاص توجہ کی جاتی تھی۔ چنانچہ مدرسۂ عالیہ کے عروج کے بعد ۱۸۸۷ء (۱۲۹۶ ف) میں، حیدرآباد کالج بھی، نظام کالج کے نام سے اسی کے ساتھ ملحق کردیا گیا۔

مذکورۂ بالا مدارس کے علاوہ اسی زمانے کے قریب، بلدہ میں چند

اور درسگاہیں بھی قائم ہوئیں۔ اِن میں سے چند تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔

مدرسۂ نظامیہ، جو حیدرآباد میں درسِ نظامیہ کا واحد مرکز ہے۔ مولوی امیرالدین حیدرآبادی نے اوائل ۱۸۸۳ء / ۱۲۹۲ف میں قائم کیا تھا، اِسلامی علوم اور دینیات کے لئے یہ مدرسہ مخصوص تھا۔ تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ مدرسہ سے متعلق ایک اقامت خانہ ابتدا ہی سے قائم تھا، جس میں غریب بچے شریک کئے جاتے، خورونوش اور قیام کے لئے اُن سے کچھ نہیں لیا جاتا تھا۔ بلکہ لباس بھی مدرسہ کی طرف سے انہیں مفت ملتا تھا۔ یہ سب کام بانیٔ مدرسہ کی علو ہمتی سے چلتے تھے۔ وہی اُس کے پورے اخراجات کے کفیل تھے۔

چند سال بعد، بانیٔ مدرسہ کی زندگی ہی میں بعض وجوہ سے مدرسہ کے دو ٹکڑے ہوگئے، ایک حصّہ تو مولوی امیرالدین کے پاس ہی رہا۔ دوسرا مولوی انوار اللہ خاں، نواب فضیلت جنگ مرحوم سے متعلق ہوگیا۔ مولوی امیرالدین کے انتقال کے بعد، مدرسہ کے دونوں حصّے ملا دئے گئے اور مولوی انوار اللہ خاں نے اس کے انتظامات اپنے ذمہ لے لئے۔ یہ زمانہ مدرسہ کے عروج کا تھا۔ ۱۸۹۹ء / ۱۳۰۹ف میں، حضرت غفران مکاں نے مدرسہ کے اخراجات کے لئے پانچ سو روپے ماہوار امداد مقرر فرمائی۔ اس عرصہ میں مدرسہ کئی مکانوں میں منتقل ہوتا رہا۔ اور آخر کار نواب سلیمان جاہ کی دیوڑھی کے قریب اُٹھ آیا۔ یہ مکان بھی ناکافی تھا، ارکان مدرسہ کی درخواست پر حضورِ پرنور نے کسارٹھ میں

ایک سرکاری مکان مدرسہ کو مستقل طور پر عنایت فرمایا۔ سنہ ۱۳۰۱ف سے محکمۂ تعلیمات سرکار عالی کی طرف سے دو سو روپے ماہوار امداد جاری ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۲ء ۱۳۲۱ف میں، موجودہ اعلیٰحضرت نے مدرسہ کی سابقہ امداد میں ایک ہزار تین سو ماہوار کا اضافہ فرمایا اور شبلی گنج میں ایک وسیع مکان بھی مرحمت ہوا جس میں مدرسہ اس وقت تک موجود ہے۔ ملک کے بعض بڑے بڑے علماء، اسی مدرسے کے فارغ التحصیل ہیں مدرسہ خود اپنے امتحانات لیتا اور مولوی، مولوی عالم، مولوی فاضل اور مولوی کامل کی سندیں دیتا ہے۔

مدرسۂ منصبداراں، سنہ ۱۸۹۵ء ۱۲۸۶ف میں منصبداروں کی اولاد کو تعلیم دینے کے لئے سرکاری طور پر قائم کیا گیا تھا۔ ہر طالب علم سے، سرپرست کی منصب کا دو فیصد، بطور فیس لیا جاتا تھا۔ لیکن لزوم کے کوئی قواعد نہیں تھے۔ اس لئے ایک سال کے اندر طلبہ کی قلت کے سبب یہ مدرسہ برخاست کر دیا گیا۔ سنہ ۱۳۰۶ف میں دوبارہ ٹوٹنے کے لئے یہ پھر قائم ہوا۔ تیسری اور آخری دفعہ نواب عماد الملک کے دورِ نظامت میں، "مدرسۂ منصبدارانِ رکابِ شاہی" کے نام سے اِس کا احیا ہوا۔ یہ زمانہ اِس مدرسہ کے عروج کا تھا۔ تعلیم مفت ہوتی تھی۔ اور دارالعلوم کا نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ سالہا سال تک اِس کے طلبہ جامعۂ پنجاب کے امتحانات میں کامیاب ہوتے رہے۔ مدنی صاحب کی صدارت میں اِس کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ اِس کے بعد اِس مدرسہ پر

پھر نزاع کی حالت طاری ہوئی جس میں یہ عرصہ تک رہ کر، مدرسہ وسطانیہ، شاہ علی بنڈہ میں ضم ہوگیا۔ اسی نوعیت کی ایک اور درسگاہ "مدرسۂ سرداران" کے نام سے گلبرگہ میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے بانی مُلا عبدالقیوم مرحوم تھے۔ ملا صاحب کی دلچسپی سے یہ مدرسہ کچھ عرصہ تک عمدگی سے چلتا رہا۔ بعد کو یہ مدرسہ فوقانیہ گلبرگہ میں ضم کردیا گیا۔

مدارس خاص جو اس کے قریبی زمانے میں قائم ہوئے، انجینیرنگ اسکول اور نارمل اسکول ہیں۔ انجینیرنگ اسکول ۱۸۷۰ء میں قائم ہوا تھا۔ ۱۸۷۱ء میں مسٹر ولکنسن اس کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ یہاں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۸۹۷ء میں بعض مجبوریوں کی وجہ سے یہ مدرسہ برخاست کردیا گیا۔ لیکن اس وقت بمقام ہنمکنڈہ ایک مدرسۂ انجنیری قائم تھا۔ جو ۱۸۷۶ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کے بیس سال بعد یہ مدرسہ حیدرآباد میں منتقل کیا گیا۔ ۱۹۲۸ء تک یہ برابر قائم رہا۔ اس سنہ میں یہ جامعۂ عثمانیہ کے کلیۂ انجنیری میں ضم کردیا گیا۔

نارمل اسکول کا خاکہ ۱۸۷۲ء میں مسٹر ولکنسن ہی تیار کرچکے تھے۔ ان کے جانشین مولوی عنایت الرحمن خاں نے سب سے پہلے یہی مدرسہ قائم کیا ۱۸۸۳ء لیکن اس کو زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ اس لئے دو تین سال بعد یہ مدرسہ دارالعلوم میں ضم کردیا گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد گلبرگہ میں اردو اور ورنگل میں تلنگی نارمل اسکول کھولے گئے۔ ۱۸۸۹ء میں یہ دونوں مدارس بلدہ میں ایک جا منتقل کئے گئے اور مرہٹی اور کنڑی کی شاخیں بھی تھوڑے عرصہ کے بعد کھول دی گئیں۔ عرصہ تک

یہ مجموعہ "مدرسہ تعلیم المعلمین" کے نام سے عابد کی شاپ کے پاس قائم رہا ۱۹۲۹ء میں
بی ٹی کی تعلیم کے لئے یہ جامعہ عثمانیہ سے ملحق کر دیا گیا۔

اس وقت تک ملک میں تحصیل علم کا شوق عام ہو چکا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ
سرکاری مدارس کی روز افزوں زیادتی کے باوجود بھی، کئی خانگی مدارس کھولے گئے
جیسے "مدرسۂ اعزہ"۔ "مدرسہ مفید الانام" (اعتبار چوک) "دھرم ونت وایگلوورناکیولر اسکول" وغیرہ

مدرسۂ اعزہ بھی مدرسہ عالیہ کی طرح ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ۱۸۷۸ء
میں نہایت اہتمام سے قائم ہوا۔ پچھتر ہزار کا چندہ اس کے لئے جمع کیا گیا تھا۔ نواب عماد الدولہ
اس کے معتمد تھے ۱۸۸۲ء سے سرکار سے تین سو روپیہ امداد بھی مدرسہ کے نام جاری
ہوئی۔ بالآخر اس کی غیر معمولی کامیابی نے حضرت غفران مکان کی توجہ اس مدرسہ کی
طرف منعطف کی۔ مرشد زادوں کی تعلیم یہاں ہونے لگی اس وقت ملک پیٹ میں اس کی ذاتی
عمارت موجود ہے۔ جہاں یہ مدرسہ نہایت منظم طریقہ پر کام کر رہا ہے

مدرسہ مفید الانام ملک کے علم دوست کھتری طبقے کی دلچسپی کا نتیجہ ہے یہ ۱۸۷۹ء
میں قائم ہوا ۱۸۹۶ء مطابق ۱۳۰۵ف سے اس کو سرکاری امداد جاری ہوئی۔ آج تک یہ نہایت
نیک نامی کے ساتھ ملک کی تعلیمی خدمت انجام دے رہا۔

دھرم ونت اسکول ۱۸۸۰ء میں ملوالوں کی دیوڑھی میں قائم ہوا تھا۔ اس کے
قیام کے چند سال بعد اس کو بھی سرکاری امداد ملنے لگی۔ حیدرآباد کا علم دوست کایستھ طبقہ اس
مدرسہ کے وجود کا سبب ہے۔ "مدرسہ مفید الانام" کے دوش بدوش یہ مدرسہ بھی برابر علم کی خدمت کئے جا رہا ہے

۳

تعلیم مستحکم بنیادوں پر

۱۸۸۰ء اور ۱۹۰۵ء کے درمیانی زمانہ کی اہمیت۔ ۱۸۹۰ء کی تنظیم جدید۔ عام تعلیم کی ترقی۔ دارالعلوم کا عروج۔ انگریزی تعلیم کے نتائج۔ اورنگ آباد میں سکنڈ گریڈ کالج کا قیام۔ سول سروس کلاس "مدرسۂ فخریہ" کا دارالعلوم سے الحاق۔

تعلیم مستحکم بنیادوں پر

حیدر آباد دکن تعلیمی تاریخ میں ۱۸۸۷ء ۱۲۹۷ف اس لئے اہم ہے کہ اِس سال حیدر آباد میں اعلیٰ مغربی تعلیم کی درسگاہ ، "حیدر آباد کالج" کا قیام عمل میں آیا۔ گویا اِس سال سے ملک میں اعلیٰ انگریزی تعلیم کی ابتدا ہوئی انگریزی تعلیم کی بنیاد ملک میں یوں تو انیسویں صدی کے ربع اول میں پڑ چکی تھی لیکن عام انگریزی تعلیم کا آغاز قیام دارالعلوم کے سال ۱۸۵۶ء ۱۲۶۶ف سے شمار ہونا چاہئے۔ کیونکہ اِس سے پہلے ، انگریزی صرف مشنری مدارس تک محدود تھی جس میں عام اہل ملک اپنی اولاد کو بھیجنے سے احتراز کرتے تھے۔

۱۹۰۷ء ۱۳۱۶ف سے اعلیٰ تعلیم کے ضابطے کی ابتدا ہوتی ہے۔ مشرقی تعلیم کی عظیم الشان درسگاہ "دارالعلوم کالج" اور اُس کے ساتھ ، ملک میں مشرقی نظام تعلیم کا تنزل بھی یہیں سے شروع ہوا۔ اِس سال دارالعلوم کالج کا تعلق جامعۂ پنجاب سے منقطع ہوا۔ جو اِس درسگاہ کے لئے انتشار آفریں واقعہ

تھا۔ اتفاق سے یہی سال مشرقی تعلیم کے سرگرم وکیل، مولوی سید حسین بلگرامی نواب عماد الملک بہادر، کی خدمت نظامت تعلیمات سے وظیفہ پر علحدگی کا سال بھی ہے۔

اِس ربع صدی سے زیادہ مدت میں ممالک محروسہ سرکار عالی کی عام تعلیم کو معتدبہ ترقی ہوئی۔ اِس میں شک نہیں کہ یہ قریب تیس سال کا زمانہ اِس قدر وسیع ہے کہ خود اِس پر ایک کتاب تصنیف ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم محض عصر حاضر کی تعلیمی ترقیوں کی عقبی زمین پیدا کرنے کے لئے اس زمانے کی اہم تعلیمی خصوصیات اور تحریکات پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس تعلیمی دور کی ابتدا ۱۴۰ مدارس، ۶۷۵۲ طلبہ، دو نظامات اور ایک نوزائیدہ محکمۂ تعلیم اور تقریباً ایک لاکھ کے سالانہ تعلیمی مصارف سے ہوتی ہے۔ اِس تیس سال کے عرصہ میں سررشتۂ تعلیم اُستوار بنیادوں پر قائم ہو گیا۔ مدارس کی تعداد ۹۰۲ اور طلبہ کی تعداد ۶۱۳۷۷ ہو گئی۔ اور سالانہ مصارف تعلیم چھ لاکھ سے اوپر ترقی کر گئے۔

اِس مدت کے ابتدائی پانچ سال تک، سررشتۂ تعلیم مولوی عنایت الرحمن خاں معتمد و ناظم کے زیر نگرانی رہا۔ آخری پچیس سال کے عرصہ میں نواب عماد الملک بہادر ناظم تعلیمات رہے۔ نواب عماد الملک کے تقرر تک ممالک محروسہ کی تعلیم کا انصرامی محکمہ، عبوری حالت میں تھا۔ گزشتہ باب میں اِس کی تشکیل کا

بیان گزر چکا ہے۔ اِس محکمہ کا کام پہلے پہل مدرسہ دارالعلوم اور اُس کی شاخوں کے علاوہ مدرسہ فوقانیہ انگریزی چادرگھاٹ، اور مدرسہ تعلیم المعلمین کی نگرانی تک محدود تھا۔ اضلاع کی تعلیم میں محکمہ مال کے عہدہ دار بھی اسکے شریک تھے۔ نواب عماد الملک بہادر کی قیادت میں محکمہ نے ملک کی تمام درسگاہوں تک اپنا اثر وسیع کر دیا۔ اور اُس کی وہ شکل بنی جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

عام تعلیم کی حد تک، یہ زمانہ مستقل اور معین رفتار ترقی کا تھا۔ نواب عماد الملک سے پہلے سررشتہ مستقل وجود حاصل کر چکا تھا۔ نواب صاحب نے اس کی جدید تنظیم کی سب سے پہلے ۱۸۸۶ء ۱۲۹۸ف میں مدارس کے طبقے مقرر کئے گئے۔ اس وقت تک مدارس، مدارسِ فارسی، مدارسِ مرہٹی، مدارسِ تلنگی اور مدارسِ تعلقہ اور مدارسِ ضلع کے ناموں سے موسوم تھے ۱۲۸۹ف تک انگریزی تعلیم بلدہ کے خاص خاص مدارس میں دی جاتی تھی۔ اِس سنہ میں مدارس چار طبقوں پر منقسم کئے گئے۔ ہائی اسکول، مڈل اسکول، اپر پرائمری مدارس اور لوئر پرائمری مدارس۔ مستقر صوبہ کے مدارس ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہوئے، اور اضلاع اور تعلقات کے مدارس علی الترتیب مڈل اسکول، اور اپر پرائمری یا لوئر پرائمری مدارس کہلائے۔ قدیم نصاب تعلیم میں بھی وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ سب سے پہلی تبدیلی کا ذکر، صوبہ جنوبی

کے مہتمم مسٹر ملی لکشمن نے کیفیت نظم و نسق، بابتہ ۱۸۸۹ء میں اس طرح کیا ہے:
"نخبتہ ہدایت تعلیم سابقہ منسوخ ہوا۔ اور نخبتہ ہدایت تعلیم جدید رائج کیا گیا۔
اول الذکر میں صرف اردو کتابیں شریک تھیں۔ آخر الذکر میں، فارسی علوم
دینیہ، ورانگریزی بھی شریک[1] ہے۔" بعد کی تبدیلیوں نے ممالک محروسہ
سرکار عالی کے تعلیمی نصاب کو، برطانوی ہند کے تعلیمی معیار تک بلند کر دیا۔

مدارس اور نصاب کی اصلاح کے ساتھ ہی، اوّلین موقعے پر طبقۂ
اساتذہ کی اصلاح بھی ضروری تھی جس کا سرانجام اس تعلیمی عہد کے ابتدائی
سنین میں، مدرسۂ تعلیم المعلمین، بلدہ کے قیام سے کیا گیا۔ ابتدائی زمانہ میں
معلمین کی تنخواہیں بہت قلیل تھیں بعض صرف پانچ روپے ماہوار بھی پاتے
تھے۔ مگر عام طور سے ۸ ۔ ۱۰ ۔ ۱۵ اور ۲۰ تنخواہ ہوتی تھی۔ تربیت یافتہ
اساتذہ فراہم ہو جانے کے بعد ۱۸۸۲ء (۱۲۹۱ف) میں، مدرسین کی تنخواہوں کی حسب
ذیل شرحیں مقرر کی گئیں:-

مدارسِ اضلاع کے لئے ۔ ۱۰ ، ۱۵ اور ۲۰

مدارس تعلقات کے لئے ۔ ۲۵ ، ۳۰

مہتموں کو دورے کی ترغیب دینے کے لئے، دوران سفر میں روزانہ
ایک روپے کے حساب سے بھتہ ایصال کرنے کی منظوری صادر ہوئی۔ پہلے پہل

---

[1] کیفیت کا قلمی نسخہ کتب خانۂ نظامت تعلیمات میں موجود ہے۔

بُعدِ مسافت کے سبب ایک مہتمم کا، پورے صوبے کے مدارس کا معائنہ کرنا مشکل کام تھا۔ یہ دقت ناظروں کے تقرر سے رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔

جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے، یہ زمانہ ترقی تعلیم کی ابتدا کا ہے سینکڑوں مدارس، جدید قائم کئے گئے، قدیم مدارس کی اصلاح اور تنظیم عمل میں آئی۔ اور تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کی متواتر کوششیں کی جاتی رہیں۔

اضلاع میں عام تعلیم کے علاوہ صنعتی مدارس بھی، ۱۸۹۱ع ۱۳۰۸ف سے کھولے جانے شروع ہوئے۔ سب سے پہلا صنعتی مدرسہ اورنگ آباد میں اسی وقت کھولا گیا۔ رفتہ رفتہ سررشتہ تعلیم کی نگرانی میں، تقریباً اکثر ضلعوں میں صنعتی مدارس قائم ہو گئے۔ صنعتی مدارس کا قیام پیشہ ور طبقوں کی اولاد کو طلبِ علم کا شوق دلانے کے خیال پر مبنی تھا۔ ان مدارس میں صنعتوں کے ساتھ ساتھ تعلیم و تدریس بھی ہوتی تھی لیکن سررشتہ تعلیم کی کوششوں کے باوجود، یہ مدارس کبھی کوئی نمایاں ترقی نہ کر سکے۔ کیونکہ پیشہ ور اپنی اولاد کو مدرسہ میں بھیجنے سے اپنے ساتھ رکھکر پیشہ کی تعلیم دینے میں زیادہ فائدہ تصور کرتے ہیں صنعتی مدارس کے علاوہ، پولس کی تربیت، اور جنگلات کی تعلیم کے لئے بھی مدرسے قائم کئے گئے یہ عموماً محکمۂ متعلقہ کی نگرانی میں تھے ۱۳۱۳ف کے قریب اورنگ آباد میں مدرسہ زراعت بھی کھولا گیا تھا۔

اس عصر کے ابتدائی سالوں میں، دارالسلطنت میں کئی مدارس نئے

قائم ہوئے۔ ان میں "مدرسہ اعزہ" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ زیر نظر عہد میں حیدرآباد کی اعلیٰ تعلیم ایک مخصوص تاریخ رکھتی ہے ۱۲۸۴ھ ۱۸۶۷ء میں مدارس میٹرک کے امتحانات جاری ہونے سے اور ۱۸۸۰ء میں "حیدرآباد کالج" کے قیام سے، ابتدائی جماعتوں سے لے کر جامعی درجے تک انگریزی تعلیم کی تنظیم ہوگئی۔ مدرسہ دارالعلوم ابتدائی زمانے میں تعلیم کے ساتھ ساتھ امتحانی ادارہ کی بھی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن ۱۲۹۹ف میں، حکومت نے دارالعلوم کالج کو جامعۂ پنجاب کے ساتھ ملحق کر دیا۔ جس سے مشرقی تعلیم بھی تحتانی، رشدیہ اور کالج کے درجوں تک مکمل ہوگئی۔

۱۸۹۱ء ۱۳۰۱ف سے لے کر ۱۹۰۹ء ۱۳۱۹ف تک دارالعلوم کی ترقی، قرطبہ اور بغداد کی علمی ترقیوں کا منظر پیش کر دیتی ہے۔ ہندوستان اور خود حیدرآباد میں انگریزی تعلیم کے بڑھتے ہوئے شوق کے باوجود، اس مشرقی درسگاہ کی رونق روز افزوں ترقی کرتی گئی۔ یہ نہایت پر معنی حقیقت ہے، اور حیدرآباد کے آئندہ تعلیمی نظام کی ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ ۱۸۹۷ء کے بعد تو دارالعلوم کی کی مقبولیت کے مقابلے میں خالص انگریزی تعلیم کا کالج، پست نظر آنے لگا تھا۔ اس کے شاندار نتائج نے حکومت کے سامنے ایک ایسا معیار قائم کر دیا کہ، انگریزی کالج اس عرصہ میں کبھی اس کی گرد کو نہ پہنچ سکا۔ زیر نظر عہد کے آخری زمانے میں اس درسگاہ کے طلبہ جامعہ پنجاب کے امتحانات

میں بھی ممتاز حیثیت پیدا کرنے لگے تھے ۔ دارالعلوم کی انہیں کامیابیوں کی بدولت ملک کے قدیم اور جدید مدرسوں میں ، اس کے نصاب رائج ہوگئے تھے ۔ چنانچہ اضلاع کے کئی مدارس ایسے تھے ، جو انگریزی تعلیم کے لئے مخصوص تھے ۔ لیکن طلبہ کے بڑھتے ہوئے شوق کے مدنظر ، منشی ، مولوی ، دبیر اور عالم کی جماعتیں خانگی یا سرکاری غرض کسی نہ کسی حیثیت سے قائم کرنے پر مجبور ہوگئے تھے ۔ دارالعلوم کے ساتھ ساتھ یہ مدارس بھی اپنے اپنے امیدوار جامعۂ پنجاب کے امتحانات کے لئے تیار کرتے تھے ۔

دارُالعلوم کے فارغ التحصیل ، اپنے کردار ، اپنی قابلیت اور صلاحیت ہر اعتبار سے کسی جامعہ کے لئے بھی باعث فخر ہوسکتے تھے ۔ اس درسگاہ کے احسانات ، آج تک ملک کی علمی فضا پر باقی ہیں ۔ اُس زمانے میں تو ملک کی علمی اور عملی رونق اور چہل پہل ، دارالعلوم کی بدولت تھی ۔ جس طرح اس درسگاہ نے ملک کو اعلیٰ تعلیم یافتہ عہدہ دار دیئے ، اسی طرح ، اس نے پبلک خدمت گزار بھی پیدا کئے ۔ موجودہ زمانے سے پہلے حیدرآباد کی شائستگی کو بنانے میں اس ادارے کا بڑا حصّہ ہے

مشرقی تعلیم کے دوش بدوش انگریزی تعلیم بھی ملک میں بارآور ہو رہی تھی ۔ کالج کی جماعتیں ، ۱۸۷۸ء میں ، مدرسہ فوقانیہ چادرگھاٹ میں کھولی گئیں ۔ کالج کے پہلے صدر ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادیہ تھے ، جنکی سماجی اور

علمی خدمات کی یاد اہل ملک کے ذہنوں میں آج تک تازہ ہے ۱۸۸۳ء ۱۲۹۲ف میں ڈاکٹر اگور ناتھ کے ہٹتے ہی، کالج کے انتظامات خراب ہونے شروع ہوئے۔ کچھ عرصہ تک کے لئے بی، اے کی جماعتوں کو مسدود بھی کر دینا پڑا بالآخر ۱۸۸۵ء ۱۲۹۶ف میں، حکومت نے کالج کی فلاح، اس کا تعلق مدرسۂ فوقانیہ انگریزی چادرگھاٹ سے منقطع کر کے، مسٹر ہڈسن کی نگرانی میں مدرسۂ عالیہ کے ساتھ وابستہ کرنے میں دیکھی۔ اب یہ "نظام کالج" کے نام سے موسوم ہوا مسٹر ہڈسن کی صدارت میں کالج نے معتد بہ ترقی کی ۱۸۹۲ء میں جب کالج کی عمارت استوار بنیادوں پہ قائم ہو چکی تو نواب سر وقار الامرا بہادر کے عہد میں اضلاع کو جامعی تعلیم کی سہولتیں عطا کرنے کے مقصد سے، حکومت نے مدرسۂ فوقانیہ انگریزی، اورنگ آباد میں بھی کالج کی جماعتیں کھول دیں۔ یہ سکنڈ گریڈ کالج تھا۔ اور چودہ سال تک قائم رہا۔ لیکن اس عرصے میں اس کے طلبہ کی تعداد کبھی (۶) سے آگے نہیں بڑھی۔ اوسطاً تین چار لڑکے یہاں تعلیم پاتے تھے۔ ایک دو سال ایسے بھی گزرے کہ اساتذہ کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا پڑا۔ آخرکار ۱۹۰۵ء ۱۳۱۴ف میں حکومت نے اس کو برخاست کر دیا۔

ایچ، ایس، ال، سی کے امتحانات قائم ہونے سے پہلے نظام کالج بھی قلت طلبہ کا شاکی رہا۔ تاہم ملک بھر میں اعلیٰ انگریزی تعلیم کا یہی ایک مرکز تھا۔ اس لئے طلبہ کی کافی تعداد جمع ہو جاتی تھی۔ جامعۂ مدراس

کی مشہور قدامت پرستی نظام کالج کی رفتار کو بہت کچھ ضبط میں رکھتی رہی،
لیکن بہر حال اس رفتار میں استقامت ضرور تھی۔ اور سچ پوچھو تو اس
ادارے کی مدد کے بغیر، جس طرح ملک کی تعلیم کافی ہوتی، اسی طرح، موجودہ
تعلیمی نظام کا تخیل بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ ملک کے نظم ونسق کو، برطانوی
ہند کے معیار تک پہنچانے میں، اور مغربی روشنی کو ملک کے اندر پھیلانے میں
نظام کالج کے فارغ التحصیل ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔

ملک کے نظم ونسق کے لئے عہدہ داروں کی تربیت کی جماعت
جو مدرسہ عالیہ میں قائم کی گئی تھی، بعد میں نظام کالج سے متعلق ہو گئی۔ اس
جماعت یعنے سول سروس کلاس پر موجودہ صدی فصلی کا ابتدائی زمانہ
بڑا سخت گزرا۔ اس کے فارغ التحصیل، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے
اور خالی شدہ عہدے پر ہوتے رہتے تھے۔ اس قدر ناشناسی کی شکایت
مسٹر ہڈسن نے مدرسہ عالیہ کی سالانہ رپورٹ میں سخت الفاظ میں کی ہے۔
اس کس مپرسی نے بالآخر ۱۸۹۹ء میں، سول سرویس جماعت کو
توڑ دیا۔ اور ۱۹۱۲ء (۱۳۲۲ف) تک پھر کسی نے اس کا نام نہ لیا۔ نواب سر حیدر نواز جنگ
بہادر نے اپنے زمانہ معتمدی تعلیمات میں، اس کا پھر سے احیا کیا اور اس کے
فارغ امیدواروں کو جذب کرنے کے متعلق نہایت صحت بخش قواعد منضبط
کئے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد سول سروس کے تربیت یافتہ آج

ملک میں ایک غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں ۔

قدیم شہرت کا "مدرسہ فخریہ"، جو سرکاری مدارس کے یکے بعد دیگرے قائم ہونے کی وجہ سے اپنی مرکزیت اور اہمیت کھونے لگا تھا، دارالعلوم کے عروج کے ساتھ، زندہ ہو گیا۔ لیکن اس دور میں اپنی انفرادیت کو ترک کر کے اس نے دارالعلوم کا نصاب تعلیم رائج کر لیا۔ سنہ ۱۹۱۰ء کے بعد سے اس نظام تعلیم کے زوال تک، ملک کی تعلیمی خدمت میں اس نے دارالعلوم کا بڑا ہاتھ بٹایا۔ یہ بھی جامعہ پنجاب کے امتحانات مولوی، عالم، اور دبیر وغیرہ کے لئے طلبہ کو تیار کرتا تھا۔ اس زمانے میں سینکڑوں طلبہ نے یہیں تعلیم پاکر جامعۂ پنجاب سے سندیں حاصل کیں۔ جب دارالعلوم پر بُرے دن آئے تو اس مدرسہ نے بھی حق اخوت ادا کیا۔ گو دارالعلوم اپنی ہئیت بدل کر جامعہ عثمانیہ کے ساتھ ضم ہو گیا ہے لیکن یہ مدرسہ اپنی قدیم وضعداری پر آج تک بھی قائم ہے۔ اور برابر ملک کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

۴

عبوری زمانہ

عماد الملک بہادر کی سبکدوشی اور ڈاکٹر سراج الحسن کا تقرر نظامت تعلیمات پر۔ مدرسۂ دارالعلوم کا انقطاع جامعۂ پنجاب سے۔ ڈاکٹر الماس کی تعلیمی نظم و نسق تعلیمات۔ سررشتۂ تعلیمات کے امتحانات علوم مشرقیہ۔ قیام جامعہ کا احساس از سر نو پیدا ہوا۔ اصلاح تعلیم کے لئے ماہرین کا تقرر۔ علامہ شبلی کی تجویز۔ مسٹر میو کا نظام تعلیم اور سفارشات۔ نظام کالج پی، سی، ایس کا دوبارہ قیام۔ ملک کی حقیقی تعلیمی ضرورت۔

عبوری زمانہ

حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں، یہ زمانہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ سب سے پہلے شکست و ریخت اور پھر احساس تعمیر و اصلاح کے آغاز کا زمانہ ہے۔ آئندہ عہد کی تحریکات جو حسن اتفاق سے اعلیحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کی سریر آرائی سے شروع ہوتی ہیں، اسی زمانہ کا نتیجہ ہیں۔ بعد کی تمام اصلاحی اور تعمیری تحریکات اس زمانے کے تعلیمی تنزل ہی سے پیدا ہوئیں۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں نواب عماد الملک بہادر، ربع صدی کی طویل خدمات کے بعد، وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ اور اُن کے جانشین ڈاکٹر سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ہوئے عام تعلیم کی حد تک یہ زمانہ بُرا نہیں ہے، اِس کی ابتدا یعنے سنہ ۱۹۰۵ء میں کل سرکاری مدارس کی تعداد ۸۸۲ اور طلبہ کی تعداد ۵۹۸۲۱ تھی۔ اس کے اختتام کے سال میں یہ تعداد ترقی کرکے

علی الترتیب ۲۵۷۹ اور ۳۷۶۴۲ تک پہنچ گئی۔ یعنی ۱۳۱۶ف تا ۱۳۲۶ف کے عرصہ میں مدارس کی تعداد تین گنی ہوگئی اور طلبہ کی تعداد میں بھی تقریباً اسی تناسب سے اضافہ ہوا۔ اس میں مدارس خاص بھی شامل ہیں، جن کی تعداد اس زمانے میں پانچ گنی ہوگئی تھی۔

لیکن اعلیٰ تعلیم کے اعتبار سے یہ دس سال نہایت صبرآزما ثابت ہوئے حکومت نے اس کل کو درست کرنے کی جتنی کوششیں کیں وہ سب اکارت معلوم ہوتی تھیں۔

اس زمانے میں سررشتہ کی قیادت یکے بعد دیگرے دو نظاء نے کی۔ ڈاکٹر سید سراج الحسن ۱۳۲۲ف تا ۱۹۱۳ء تک ناظم رہے اور بعد کے چار سال ڈاکٹر المالطیفی آئی، سی، ایس، کے زیر اہتمام گزرے۔

۱۳۱۶ف ۱۹۰۷ء میں جامعات کی حدود ارضی معین ہوجانے کے سبب دارالعلوم کالج کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے منقطع ہوگیا۔ اس کے بعد کے دو سال، اس درسگاہ پر نہایت انتشار کے گزرے۔ امتحانات کے موقوف ہوجانے کے سبب اکثر طلبہ کو بے حد مایوسی ہوئی۔ کئی ایک متعلمین نے مدرسہ ترک کردیا۔ طلبہ کی اس پریشانی کو دیکھ کر، مُلّا عبدالقیوم، ڈاکٹر اگورناتھ، مولانا سید علی حیدر طباطبائی (حیدر یار جنگ) اور ملک کے بعض اور علما نے، جامعۂ پنجاب کے امتحانات کے مماثل امتحانات خانگی طور پر لینے اور طلبہ کو سندیں دینے

کا انتظام کیا۔ کئی طلبہ ان امتحانات میں شریک ہوئے۔ اور جو کامیاب ہوئے انہیں سندیں دی گئیں۔

سررشتۂ تعلیمات کی جانب سے بھی السنہ مشرقیہ کے امتحانات قائم کرنے کی کوشش شروع ہوئی لیکن ان انتظامات کو مکمل ہوتے ہوتے دو سال لگ گئے اور ۱۹۰۹ء ۱۳۱۸ف سے پہلے یہ امتحانات قائم نہ ہو سکے۔

محکمۂ تعلیمات کے امتحانات، اس میں شک نہیں کہ، جامعہ پنجاب کے معیار سے کسی طرح کم نہیں تھے تاہم پہلے پہل لوگوں پر ان اسناد کا جامعہ کی سندوں کا سا رعب نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس لئے طلبہ کا رجحان علوم مشرقیہ کی طرف سے ہٹنے لگا۔ اور ملک کی اعلیٰ تعلیم پر پژمردگی چھا گئی امتحانات قائم ہونے کے دوسرے ہی سال سے عوام اور حکومت دونوں نے اس پژمردگی کے اثرات کو محسوس کرنا شروع کیا۔

ایسے موقع پر، انگریزی تعلیم کے نتائج اگر خاطر خواہ برآمد ہوتے تو ارباب اقتدار اپنی تمام کوششوں کا محور ظاہر ہے کہ اسی کو بنا لیتے لیکن جیسا تعلیمات کی رپورٹوں سے ظاہر اور حکومت کی تنقیدوں سے مترشح ہوتا ہے مغربی تعلیم کی حالت، ملک کی طلب کی مقابلے میں اطمینان بخش نہیں تھی۔ اس لئے، حکومت اور عوام دونوں کو ایک مخلوط نظام تعلیم کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

حیدرآباد میں ایک جامعہ کے قیام کی ضرورت کا احساس اُس وقت سے پیدا ہو چکا تھا، جب مدرسہ دارالعلوم کے نظام تعلیم کی وسعت اضلاع اور تعلقات تک ہوئی۔ اور پہلی دفعہ ملک میں تحریری امتحانات کا قاعدہ جاری ہوا (۱۸۷۳ء)۔ مولوی احمد حسین خاں نواب رفعت یار جنگ بہادر مرحوم، مددگار معتمد مالگزاری نے ۱۸۷۲ء/۱۲۹۲ف میں ہمدردان ملک کے نام ایک اپیل شائع کی تھی۔ جس میں مروجہ تعلیم کی خامیاں دکھا کر، ایک مدرسہ، ایک جامع العلوم کے قیام کی تحریک کی گئی تھی۔ اِس مدرسہ میں اردو، فارسی، عربی، حساب، جغرافیہ، تاریخ، اقلیدس، جبرومقابلہ اور انگریزی کے علاوہ قانون اور مالگزاری کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے متعلق نواب صاحب کی رائے حسب ذیل تھی۔

> "برائے انگریزی کہ بنظر رواج تعلیمش ضروری دانستہ می شود، بدیں نمط اہتمام رود کہ صرف تعلیم زبان یعنے تحصیل انشا در انگریزی کافی دانستہ شود وانچہ بالفعل مردم برائے تحصیل جملہ علوم بانگریزی عادت کردہ اند حق اینست کہ تحصیل آں علوم وفنون مردم ہند در زبان انگریزی بوجوہ کثیرہ قطعاً دشوار و موجب تضیع اوقات است" صـ۲

اِس درسگاہ کے لئے وہ عوام، امرا اور حکومت سے چندہ فراہم کرنا چاہتے تھے۔ نواب [illegible] بھی اِس تحریک کو بہت پسند کیا تھا۔ لیکن یہ

تحریک وجود پذیر نہ ہو سکی ۔

عماد السلطنۃ کے زمانۂ مدار المہامی میں یہ تحریک دوبارہ نہایت زور و شور سے اٹھی ۔ اِس دفعہ اس تحریک کی ابتداء مسٹر بلنٹ ، رکن پارلیمنٹ، انگلستان ، کے جامعۂ مشرقی کے خاکے کی بناء پر ہوئی ۱۸۹۲ء ۱۳۰۱ھ میں اعلیٰ حضرت مرحوم کی صدارت میں بمقام باغ عام ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں "نظام یونیورسٹی" کے قیام کی تجویز ہوئی لیکن یہ تجویز بھی سر سبز نہ ہو سکی ۔

آگے چلکر ، سر وقار الامرا کے عہدِ مدار المہامی میں اِس تحریک کا پھر احیاء ہوا لیکن حقیقت میں اِس تحریک کو اہمیت اُسی وقت حاصل ہوئی، جب مدرسۂ دار العلوم کا تعلق جامعہ پنجاب سے منقطع ہو گیا ۔ اِسی زمانے میں مدرسۂ دار العلوم کے قدیم طلبہ کی سعی سے ، حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا ۔ اور اِس طرح کی علمی اور تعلیمی تحریکات کو حکومت کے سامنے پیش کرنے کیلئے ایک مجموعی آواز پیدا ہو گئی ۔

جامعہ پنجاب سے دار العلوم کے بے تعلق ہو جانے سے جو خطرہ ملک کی اعلیٰ تعلیم کے لئے پیدا ہو گیا تھا ، اُس نے جامعۂ حیدر آباد ، مشرقی یونیورسٹی یا نظام یونیورسٹی کے خوابیدہ خیال کو از سر نو زندہ کر دیا ۔ چنانچہ السنہ مشرقی کے امتحانات قائم کرتے وقت ، مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم ، معتمد تعلیمات کے ذہن میں یہی اسکیم تھی ۔ مولوی محمد مرتضیٰ صاحب اِس سلسلے میں لکھتے ہیں

اِسی عرصہ میں مولوی محمد عزیز مرزا صاحب مرحوم معتمد عدالت ہوگئے، جنہوں نے اپنی مستعدانہ توجہ سے نہ صرف ہمارے موجودہ امتحانات قائم کئے، بلکہ اصلاحی اسکیم کو بہت زیادہ بلند پیمانہ پر، مشرقی یونیورسٹی کی شکل میں قائم کر دکھانا چاہا۔ جس سے کل ہندوستان گونج اُٹھا۔ اور مولوی شبلی صاحب نے "الندوہ" میں لکھدیا کہ وہ دارالعلوم ندوہ کو ہماری یونیورسٹی یا بالفاظ دیگر، ہمارے دارالعلوم سے ملحق کر دیں گے۔ اِن سب امیدوں کا میدان عمل میں آنا بر وقت مقتدر نہ تھا۔ ہر جگہ اصلاح کے کئی کئی مدارج طے ہوگئے لیکن دارالعلوم کی اِس وقت تک انتظار کی آنکھ کھلی ہوئی ہے"۔[1]

ایسی تعلیمی فضاء کے ساتھ عہدِ عثمانی کی ابتدا ہوئی اور اعلیٰ حضرت کی تخت نشینی کے دوسرے ہی سال، یعنے ۱۹۱۰ع؁ ۱۳۱۹ف؁ سے مروجہ نظامِ تعلیم کی اِصلاحی کوشش شروع ہوئی۔

اِس مقصد کے لئے سب سے پہلے دو ماہرانِ تعلیم مقرر کئے گئے، تاکہ وہ مروجہ تعلیم کی اصلاح کے متعلق مشورے دیں۔ اِن میں سے ایک مولانا شبلی اور دوسرے مسٹر آرتھر میہو تھے۔

مولانا شبلی، جس طرح ایک عالم اور مصنف کی حیثیت سے ہندوستان بھر

---

[1] "تاریخ دارالعلوم" ۱۳۳۲ھ؁ صفحہ ۹

میں مشہور تھے، اسی طرح تعلیمی امور پر بھی اُن کی نظر وسیع تھی۔ اس موضوع پر اُن کی کتابیں آج تک پڑھی جاتی ہیں۔ مدرستہ العلوم، علی گڑھ میں یہ عرصہ تک پروفیسر رہ چکے تھے اور تعلیم و تدریس کا انہیں عملی تجربہ بھی حاصل تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دقیانوسی خیال کے مُلّا نہیں۔ بلکہ ایک روشن خیال عالم تھے دنیا کا کافی سفر کیا تھا۔ اور پروفیسر آرنلڈ (جو بعد میں سر تھامس آرنلڈ ہو گئے) کے گہرے دوست تھے۔ مغربی خیالات سے بھی یہ نابلد نہیں تھے۔ برسوں تک سر سیّد احمد خاں کے شریک کار رہنے کے بعد، انہیں خالص مغربی تعلیم کے نتائج سے جو مایوسی ہوئی تھی، اُس کے سدِ باب کے خیال سے انہوں نے "ندوۃ العلما" قائم کیا۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ کی ابتدا بھی اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ غرض شبلی اُن سینکڑوں مفکرانِ تعلیم کے ہم خیال تھے جو خالص انگریزی تعلیم کو ہندوستان کے لئے مفید نہیں تصور کرتے تھے۔ اسی لئے جب وہ حیدرآباد کے تعلیمی نظام کی اصلاح کے لئے مقرر ہوئے تو انہوں نے مروجہ قدیم طرز کے نصاب میں بہت کچھ ترمیم کی۔ اور جدید مضامین کا اس میں اضافہ کیا۔ انگریزی بھی شریک نصاب کی گئی۔ اس طرح انہوں نے اپنی حد تک ایک مکمل نصاب مرتب کر دیا۔ اس جدید نصاب کی تعلیم بھی مدرسہ دارالعلوم میں فوراً شروع ہو گئی۔

لیکن شبلی کی تجویز ضرورت زمانہ کے مطابق نہیں تھی، یہ واقعات

اور دارالعلوم کی ناکامی نے ثابت کر دیا حقیقت میں اُن کا دائرہ فکر اس معاملے میں کسی قدر محدود تھا۔ وہ موجودہ زمانے کی جامعہ کا سا وسیع نظام نہیں بنا سکتے تھے۔ اور ملک کو ضرورت اسی طرح کے ایک نظام کی تھی۔

مسٹر میو نے درحقیقت حیدرآباد کی تعلیم کے لئے بڑی مفید خدمات انجام دیں وہ عرصہ دراز سے سررشتہ تعلیمات میں ملازم تھے اور ہندوستان کے مخصوص تعلیمی مسائل پر کافی غور و خوض کر چکے تھے۔ جب اعلیٰ حضرت نے، ۱۹۱۰ء میں، نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے دو سال تک انہیں یہاں مقرر فرمایا، تو موصوف نے، ممالک محروسہ کی مروجہ تعلیمی حالت کا وسیع اور حتی الامکان گہرا مطالعہ کیا۔ ۱۹۱۲ء میں اپنے تجربوں کی مدد سے ایک ممکنہ صحت بخش نظام تعلیم، ملک کے لئے مرتب کیا۔

مسٹر میو کی رپورٹ شائع ہو چکی ہے گو اب کمیاب ہے۔ اُن کی سفارشات کا خلاصہ بھی علحدہ کتاب کی صورت میں شائع ہوا ہے (۱۹۱۲ء) یہ حصہ درحقیقت مسٹر میو کی پوری سعی کا ماحصل ہے اور ممالک محروسہ کی آئندہ تعلیمی نظام کے متعلق معین اور مفید مشوروں پر مشتمل ہے۔ ان مشوروں میں سے اکثر ہمارے محکمۂ تعلیمات نے اختیار کئے۔

مسٹر میو نے ہر مرحلہ تعلیم کا بذات خود مشاہدہ اور مطالعہ کرنے، اور ملک کی آئندہ ضرورتوں پر کافی غور کرنے کے بعد اپنی کیفیت مرتب کی

تھی۔ اِسی لئے، بجز چند اجزا کے اکثر تعلیمی امور میں اُن کی رائے پر آج بھی عمل ہو رہا ہے۔

وہ سب سے پہلے، مصارفِ تعلیم میں اضافہ کی سفارش کرتے ہیں خصوصاً اعلیٰ اور تحقیقی تعلیم کے متعلق اُن کی رائے تھی کہ، خاطر خواہ نتائج، بغیر فراخدلی سے روپیہ صرف کرنے کے برآمد نہیں ہو سکتے۔ وہ لکھتے ہیں:۔ "یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ کالج، جب اس کا برقرار رکھنا ہی منظور ہو تو اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہونا چاہیئے۔ اور عمدہ تعلیم، چند طلبہ کے لئے بھی ایسی ہی گراں قیمت ہوتی ہے جیسی کثیر التعداد طلبہ کے لئے[1]" ملک کی تعلیمی ترقی کا انحصار اُن کے خیال میں حسب ذیل امور پر موقوف ہے۔ "ابتدائی تعلیم کی توسیع۔ اور اعلیٰ تعلیم کی عمدگی، جو مصارف کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔" "ابتدائی تعلیم، صرف بچے کی مادری زبان میں ہونی چاہئیے۔ دوسری ضروری زبانیں بعد کے درجہ سے شروع کی جا سکتی ہیں"۔ ہماری ابتدائی تعلیم اسی اصول پر منظّم ہوی ہے۔ وسطانی اور فوقانی تعلیم کے لئے وہ دو قسم کے مدارس قائم کرنے کا مشورہ دیتے ہیں (۱) انگریزی اور مقامی السنہ کے مدارس جن میں طلبہ آئندہ "انگریزی فوقانی مدارس میں داخل ہونے کیلئے تیار کئے جائیں (۲) مقامی زبان کے مدارس جو مقامی زبان میں "اردو فوقانی مدارس" کے لئے طلبہ کو تیار کر سکیں۔

---

[1] "خلاصہ سفارشات" ۱۹۱۲ء صفحہ (۴۳)

اِس طرح فوقانی مدارس کی دو قسمیں ٹھہرتی ہیں۔ (۱) انگریزی (۲) مشرقی اعلیٰ تعلیم میں ایک تو وہ نظام کالج اور اُس کے نظام تعلیم کو برقرار رکھنے کے حامی تھے۔ دوسرے دارالعلوم کی تعلیم میں اصلاح کرکے اُس کو مشرقی یونیورسٹی کے رتبہ پر پہنچانے کے طرفدار۔ ان دونوں کالجوں میں، مشترک اقامت خانوں مشترک کلب اور چند مشترک لکچروں کے ذریعہ دونوں قسم کی شائستگیوں میں ربط پیدا کرنے کو بھی وہ ملک کی تعلیمی ترقی کا سبب بتلاتے ہیں یہی کام درحقیقت اب جامعۂ عثمانیہ کے ذریعہ انجام پا رہا ہے۔

شبلی کے مجوزہ نصاب دارالعلوم کو وہ بہت بھاری بھرکم اور موجودہ ضروریات کے لئے ناکافی سمجھتے تھے[1]۔ اُس کی نظر ثانی کے لئے ایک کمیٹی قائم کرنے کی وہ رائے دیتے ہیں۔ اور اِس نصاب میں سنسکرت، مرہٹی، تلنگی اور کنڑی کی تعلیم بھی داخل کرنے کی خواہش کرتے ہیں۔ اِس نظام تعلیم کو زیادہ مفید بنانے کے لئے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کالج کے اسٹاف میں چند ایسے اساتذہ داخل کئے جائیں، جو یورپی مستشرقین کے تحت کام کرکے موجودہ تحقیقی طریقوں سے کما حقہ واقفیت حاصل کر چکے ہوں۔ جدید ذہنی شائستگی اور روشن دماغی کی پیدائش اُسی وقت ممکن ہے، جب مشرقی موضوعات

---

[1] خلاصہ سفارشات۔ صفحہ (۳۴)

موجودہ حکمی طریقوں سے روشناس کرائے جائیں تحقیقی کام کو فروغ دینے کے لئے، معین رقوم عطا کرنا ضروری ہے"۔

مذکورۂ بالا اصلاحات کے بعد اُن کا خیال تھا کہ، دارالعلوم کالج، آئندہ حیدرآباد یونیورسٹی یا مشرقی یونیورسٹی کی تمہید بن جائے گا۔

السنہ تعلیمی کے متعلق مسٹر میو کی سفارش تھی کہ ابتدائی تعلیم بچے کی مادری زبان میں دی جائے۔ آگے چلکر کوئی دوسری مقامی زبان یا مقامی زبان کے ساتھ اردو شریک کی جائے۔ اِسی سلسلے میں وہ لکھتے ہیں: "مقامی السنہ کے وسطانی مدارس اور مشرقی فوقانی مدارس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہونی چاہیئے۔ اور انگریزی اور مقامی السنہ کے وسطانی مدارس میں، دو سال کے لئے اردو، اور تیسرے سال کے لئے انگریزی، جس کی تدریس مقامی زبان کے ذریعہ ہو"[1]۔

اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کے متعلق وہ رقمطراز ہیں: ۔" ہر ملک کی ترقی میں، ایسے اشخاص کا اثر لازمی جز ہوتا ہے، جو جامعہ کی نفیس تربیت کے حامل ہوتے ہیں"۔ کسی ملک میں اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے اسباب کے منجملہ چند سبب یہ ہیں۔ " ملک کی صنعتی یا تجارتی ترقی کے سبب اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص کی ضرورت اور ملازمتوں میں حکومت کی طرف سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی قدر افزائی"

[1] خلاصہ سفارشات۔ صفحہ (۴)

آگے چلکر وہ جامعہ کی تعلیم کی افادیت کے متعلق لکھتے ہیں:۔ "اگر جامعہ کی تربیت عمدہ ہو، اور عوام اور حکومت کی پسندیدہ، نیز اگر ملک کی ترقی معتدل حالات پر مبنی ہو تو اس سے ریاست کو کوئی اندیشہ نہ ہونا چاہیئے"۔

مسٹر ہیو کی سفارشات محض نظام تعلیم کی اصلاح تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ عمدہ نظام تعلیم سے خاطر خواہ نتائج مرتب کرنے کے لئے جس طرح کے اسٹاف کی ضرورت ہے اس پر بھی صاحب موصوف نے روشنی ڈالی ہے۔

"اساتذہ کا تعلیمی تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے۔ چونکہ ملک میں فی الحال ایسے اساتذہ کی تعداد محدود ہے، اس لئے باہر سے جو لوگ لئے جائیں اُن کے متعلق کافی احتیاط برتنی چاہیئے۔ کسی غیر ملکی کا تقرر نہ ہونا چاہیئے بجز اس کے کہ وہ اپنے مقام کے کسی ذمہ دار تعلیمی عہدہ دار کا صداقت نامہ اس امر کے متعلق پیش کرے کہ اُس کا کردار اور گزشتہ طرز زندگی ہر حیثیت سے تشفی بخش رہا ہے۔ اور بجز اس کے کہ ریاست کا کوئی ذمہ دار حیثیت والا باشندہ اس امر کی تصدیق کرے کہ وہ ریاست میں ملازم رکھنے کے قابل ہے۔ جب کسی خاص اہمیت کے عہدہ پر، باہر کے کسی شخص کا تقرر کرنے کی ضرورت ہی ہو تو، کوشش کی جانی چاہیئے کہ ایسا معلم ایک معین مدت کے لئے برطانوی حکومت سے مستعار لیا جائے۔ یہ سفارشات سررشتہ تعلیمات کے دوسرے شعبوں سے بھی متعلق ہیں، جیسے مدرسہ تعلیم المعلمین،

یا نگرانکاران تعلیمی[1] وغیرہ۔

مسٹر میہو کی رپورٹ اور سفارشات، بڑی حد تک جامع اور ملک کی ضروریات کے لئے مفید تھیں، اِس لئے حکومت نے اُس کو بروئے کار لانے کا تصفیہ کرلیا اور اِس مقصد سے ۱۹۱۳ء ۱۳۳۲ف میں برطانوی ہند کے مشہور تعلیمی تجربہ کار، ڈاکٹر الماطیفی، آئی، سی، یس، کا تقرر نظامت تعلیمات پر کیا گیا۔ ۱۹۱۲ء کے بعد کی رپورٹوں پر تنقید کرتے ہوئے حکومت کا مسٹر میہو کی سفارشات کی طرف ناظم تعلیمات کو بار بار متوجہ کرنا اِس امر کا ثبوت ہے کہ وہ جلد سے جلد رپورٹ کی مندرجہ اصلاحات کو، بارآور دیکھنے کی متمنی تھی۔ لیکن ڈاکٹر اَلماطیفی، ان اصلاحات کے مکمل ہونے تک حیدرآباد میں مقیم نہ رہ سکے ۱۹۱۶ء میں انہیں اپنی اصلی خدمت، برطانوی ہند پر واپس جانا پڑا۔ اور اُن کی جگہ، سر سید احمد خاں، بانی علی گڑھ کالج کے پوتے مسٹر سید راس مسعود (سر مسعود جنگ) کا تقرر ہوا جو اِس خدمت کو آٹھ سال تک انجام دیتے رہے۔

جس زمانے میں، دارالعلوم کالج روبہ تنزل تھا۔ نظام کالج کی حالت بھی قابل توجہ بن گئی تھی۔ اِس میں شک نہیں کہ مصارف کے مقابلے میں نتائج کی ناکامی سے حکومت کو اکثر شکایت رہی۔ لیکن ۱۹۱۱ء میں جامعہ مدراس

[1] "خلاصہ سفارشات" صفحہ ۹

کے نتائج کا ایک خاص واقعہ قابل ذکر ہے۔ اس سال میٹرک کے امتحان میں ممالک محروسہ سرکار عالی کے کل مدارس سے جملہ (۲۶) طلبہ شریک ہوئے تھے۔ جن میں سے صرف (۲) کامیاب ہوئے۔ یہ ممکنہ بدترین نتائج تھے۔ جن کے خلاف حکومت نے فوراً کارروائی کی۔ میٹرک کا امتحان موقوف کرکے، اس کی جگہ ہائی اسکول لیونگ سارٹیفیکٹ کا امتحان قائم کیا گیا۔

یہ تبدیلی نظام کالج کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔ چنانچہ دوسرے ہی سال سے اس کا اثر محسوس ہونے لگا۔ گزشتہ سال کی تعداد (۴۸) کے مقابلے میں اس سال (۱۱۲) طلبہ کالج میں زیر تعلیم تھے۔ پانچ سال کے اندر اندر یہ تعداد ترقی کرتی ہوئی ڈیڑھ سو اور اُس سے اوپر تک پہنچ گئی۔

طلبہ کی تعداد میں اضافے کے باوجود نتائج کی حالت کچھ زیادہ ہمت افزا ثابت نہیں ہوئی۔ ہر سال مشکل سے دو چار طالب علم طیلسانی حاصل کرتے تھے۔ کبھی کوئی سال بغیر طیلسانی پیدا کئے بھی گزر گیا۔ ۱۹۰۱ء اور مابعد سنین کے نتائج جو رپورٹ میں مندرج ہیں، ایسے مبہم ہیں کہ اُن سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ کتنے طلبہ نے ڈگری حاصل کی۔ حکومت نے کیفیت نظم ونسق پر تنقید کرتے ہوئے نتائج کے مکمل درج کرنے کی بار بار ہدایت کی ہے۔ ۱۹۲۲ء / ۱۳۲۲ف کی رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے حکومت نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے جامعہ مدراس کے نتائج کی حالت کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

"نتایج نہایت مایوس کن ہیں .... اس کثیر رقم کے مقابلے میں جو سرکار اس تعلیم گاہ پر صرف کرتی ہے، فائدہ کس قدر قلیل ہے! ....فی طالب علم بحساب (الصہ) ایک ہزار پچاس روپلے سالانہ سرکار پر عائد ہوتے ہیں......... اگر نظام کالج کی حالت ایسی ہی غیر ترقی پذیر رہی تو بی۔اے کلاس میں آنرز کورس شریک کرنے کے لئے بہت عرصہ درکار ہے" بالآخر سنہ ۱۹۱۶ء کی تنقید میں حکومت نے انتہائے یاس سے لکھدیا کہ:-

"امتحانات جامعۂ مدراس کے نتائج نہایت مایوس کن ہیں۔ بی۔اے میں ایک امیدوار نے بھی تمام گروپ میں کامیابی حاصل نہیں کی"۔

انہیں حالات کے مدنظر، حکومت نے کالج کا تعلق نظامت تعلیمات سے منقطع کر کے، اس کو ایک مجلس انتظامی کی نگرانی میں دے دیا۔

متذکرۂ بالا، واقعات پر نظر ڈالنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ خاص انگریزی تعلیم کی رفتار ترقی گزشتہ (۵۰) سال میں ممالک محروسہ سرکار عالی کی حد تک کچھ زیادہ ہمت افزا ثابت نہیں ہوئی۔ کثیر مصارف اور تنظیم کی بار بار سعی کے باوجود، رفتار میں سرعت نہ پیدا ہو سکی۔ اس کے برخلاف انگریزی تعلیم

؎۔ رپورٹ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی بابتہ ۱۳۲۳ف صفحہ ۴

کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے باوجود مشرقی کالج کو جو وسیع مقبولیت اور ترقی حاصل ہوئی حیرت انگیز ہے۔ آخری دس سال میں مشرقی تعلیم کا تنزل، چند اسباب کے تابع تھا۔ سب سے پہلے مغربی تعلیم کی ضرورت کا احساس ملک میں عام ہو چکا تھا۔ اس احساس کی تشفی مشرقی کالج میں نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسرے جامعۂ پنجاب سے کالج کا تعلق منقطع ہو جانے سے، جامعہ کا اعلیٰ علمی تصور ملک کے سامنے سے ہٹ گیا۔ موجودہ زمانے میں کوئی ایسا نظام تعلیم اہل ملک کی تشفی کا باعث نہیں ہو سکتا تھا، جس میں انگریزی زبان اور مغربی علوم کو قرار واقعی دخل ہو۔

مذکورۂ بالا قضیوں کا صریحی نتیجہ یہ ہے کہ ملک ایک ایسے نظام تعلیم کا خواہاں تھا، جس کا اعلیٰ مرکز جامعہ کی شکل میں پیش نظر ہو، جس کی بنیاد مشرقیت پر ہو اور جس کا راستہ مغربی علوم کی طرف پوری طرح کھلا ہوا رہے۔

۵

دورِ تحریکات

جمود کے بعد ہیجان۔ دار العلوم کے فارغ التحصیل
"انجمن طلبائے قدیم دار العلوم" — "دار العلوم" کا
ساٹھ سالہ جشن۔ "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" کا قیام
کانفرنس کے سالانہ اجلاس۔ پہلے اجلاس کے اثرات
کانفرنس کی کامیابی کے اسباب اور اس کے نتائج۔

عبوری زمانہ، اعلیٰ تعلیم کے نتائج کے اعتبار سے جس قدر ہمت شکن تھا ایک دوسرے لحاظ سے اسی قدر اہم اور عہد آفریں ہے۔ یہ ۱۹۱۲ء (۱۳۲۰ف) کے بعد کی تعلیمی تحریکات ہیں جو درحقیقت گزشتہ دور ہی کا نتیجہ اور اسی تلاش کا پھل ہیں۔ جس طرح ہر طوفان کے بعد سکون کا آنا لازمی ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس بھی حیات کی ایک صداقت ہے۔ کسی گروہ کا گر کر اُبھرنا، جمود کے بعد زندگی کی لہر کا اُٹھنا روزمرّہ کے واقعات ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ ۱۹۰۵ء (۱۳۱۶ف) کے بعد حیدرآباد کی تعلیم، خصوصاً اعلیٰ تعلیم پر بوجوہات چند درچند ایک جمود، بلکہ ایک پستی طاری ہونے لگی تھی۔ لیکن اِس کے احساس کے ساتھ ہی، اور اسی پستی کے سبب، ملک کے تعلیم یافتہ طبقوں میں ایک بے چینی اور ایک تلاش پیدا ہوگئی تھی۔ فطرتیں اِس پستی سے مقابلہ کرنے کے لئے رفتہ رفتہ کمربستہ ہوگئیں۔ اور تعلیم کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

اِس بے چینی اور اضطراب کی آفرینش زیادہ تر دارالعلوم کی فارغ التحصیل جماعت کے ذریعہ عمل میں آئی دارالعلوم کے قدیم طلبہ نے جب اپنی مادرِ علم کو جان کندنی کی حالت میں دیکھا، تو اُن کا دل بھر آیا۔ اور اُس محبت نے جو ایک فارغ التحصیل کو اپنی درسگاہ سے ہو سکتی ہے، اس گروہ کے تمام اجزا کو اپنی مادرِ علم کی مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مجتمع کر دیا۔ اِس مستعد طبقے نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے ایک منظم سعی کی ضرورت محسوس کی، اور "انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم" کی بنیاد ڈالی گئی۔

"انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم کا قیام" ۱۹۱۳ء / ۱۳۲۲ف میں عمل میں آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حکومت کی مسلسل کی کوششوں کے باوجود، دارالعلوم کی عمارت قدیم بنیادوں پر ٹھہرتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بالآخر، دارالعلوم کا فیض یافتہ طبقہ اپنی بساط کے موافق حکومت کا ہاتھ بٹانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اِس طبقے میں مولوی محمد مرتضیٰ، ملّا عبدالباسط، سید رضی الدین حسن کیفیؔ اور مولوی اکبر علی جیسے ہمدردانِ ملک اور خدمت گزارانِ تعلیم شریک تھے۔ اس ہمت شکن ماحول میں ان برگزیدہ علما کی زندہ دلانہ مساعی، درحقیقت ایک خشک ریگ زار میں چشمۂ آب کی فضا سے کم اہمیت نہیں رکھتیں۔

انجمن کے قیام کا حال خود اُس کے معتمد، مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم نے اس طرح بیان کیا ہے :۔

"دارالعلوم میں ایک علمی انجمن کے قیام کی تحریک اُسی زمانے سے
ہونے لگی تھی جب کہ پنجاب یونیورسٹی کے سلسلہ تعلیم سے
اس میں ایک نیا زمانہ آغاز ہوا۔ پہلے دور کے طلبہ تو سونچتے
میں رہے، لیکن دوسرے دور کے طلبہ نے، جو بہ لحاظِ رفتار
زمانہ عملیت میں ایک قدم آگے بڑھ گئے تھے، ایک انجمن
بنام "ثمرۃ الادب" قائم کی جس نے بہت کچھ ذوق اور زندہ دلی
پیدا کی، اور اِسی انجمن کا اثر تھا کہ جب یہ نوجوان طلبہ مدرسہ
چھوڑ کر، دنیا کی بوقلموں، وسیع بے پایاں درسگاہ میں
کام کرنے لگے تو اُن میں ایک کام کرنے والی زندہ دلی کی
رُوح موجود تھی۔ اور "مادر دارالعلوم" کا خیال ہر وقت
اُن کے دلمیں رہتا تھا۔ . . . . لیکن
لکل امر مرھون باوقاتہ . . . . عملی طور سے قیام انجمن
کے لئے قادر مطلق نے ۴ رجادی الاول ۱۳۲۲ھ کی تاریخ مقرر
کردی تھی۔"[1]

اِس انجمن کے قیام سے ایسے سینکڑوں طلبہ کے لئے، جو دارالعلوم کی

---

[1] رپورٹ سالانہ انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم ۲۴-۱۳۲۳ھ ۱۹۱۵ء۔

تنزل پذیر حالت سے متاثر تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ملک کی تعلیمی ترقی کے بھی شدت سے خواہاں تھے، ایک مشترک میدان عمل، اور ایک مرکز فراہم ہوگیا۔ ایک احساس مند اور کام کا ولولہ رکھنے والی جماعت کے منظم ہوجانے کے بعد، مفید نتائج برآمد ہونا ضروری تھا "انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم" ایک نئے عصر کے آغاز کے وقت پیدا ہوئی تھی۔ اِس عصر کی تحریکات کو کامیاب بنانے میں اُس نے اپنی امکانی سعی کی۔ ملک کے خوابیدہ تعلیمی خیالات، اور احساسات کو بیدار کرنے کے لئے انجمن نے سب سے پہلے دارالعلوم کا ساٹھ سالہ جوبلی جشن، منانے کی تحریک پیدا کی۔ ۱۳۲۲ھ ۱۹۱۳ء میں یہ تقریب اِس دھوم دھام سے منائی گئی کہ نواب سالار جنگ بہادر ثالث، مدارالمہام نے اِسکی صدارت کرنے کو اپنے شایان شان سمجھا۔ اِس تقریب کے سلسلہ میں ملک کے تعلیم یافتہ گروہ نے مدت کے دبے ہوئے خیالات کو پہلی دفعہ، حکومت، سررشتۂ تعلیم اور عوام کے سامنے پیش کیا۔ کہنے کو تو یہ دارالعلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کی تقریب تھی، لیکن اِس میں جو تقریریں ہوئیں، اور اس سے جو علمی اور تعلیمی تحریکیں پیدا ہوئیں، اُن کا بواسطہ یا بلاواسطہ ملک کی تعلیمی ترقی پر اثر پڑا۔ "دارالعلوم کی تاریخ" پر جو مضمون پڑھا گیا تھا، وہ درحقیقت حیدرآباد میں ترقی تعلیم کا ایک سرسری خاکہ تھا۔ تحریکات میں سب سے زیادہ اہم، حیدرآباد کے لئے ایک جامعہ کے قیام کا مطالبہ تھا۔ مذکورۂ بالا مضمون میں

نہایت جوش کے ساتھ یہ تحریک پیش کی گئی ہے ۔

"ہمارے ملک میں دارالعلوم قائم ہے جس کے امتحانات ہمارے ہاتھ میں ہیں، ضرورت ہے کہ ان امتحانات کی بنا مستحکم طور سے قائم ہو۔ یا بالفاظ دیگر نظام یونیورسٹی قائم کی جائے۔ مشرقی یونیورسٹی قائم ہونے کے لئے حیدرآباد میں کسی قسم کی کوئی دقت نہیں ہے۔"[1]

"انجمن طلبائے قدیم" دارالعلوم کئی سال تک کارگزار رہی۔ اس کے قابل ذکر کارناموں میں ایک نائٹ کلاس کا قیام ہے جس میں دارالعلوم کے قدیم اور جدید طلبہ کو انگریزی کی تعلیم باضابطہ طور پر دی جاتی تھی۔ انجمن نے اپنی اس تحریک کو جامۂ عمل پہنا کر گویا، ملک کے لئے ایک مخلوط نظام تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا کر دیا۔ نائٹ کلاس میں ملکی زبانوں کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ انجمن نے ایک فنڈ قائم کیا تھا جس سے مستحق طلبہ کو وظائف دئے جاتے تھے۔ حقیقت میں "انجمن طلبائے قدیم" ایک تعلیمی انجمن تھی، جس کا مقصد تعلیم کی اشاعت اور اصلاح تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا مقاصد "انجمن طلبائے قدیم" کے

---

[1] تاریخ دارالعلوم صفحہ ۱۲

ذریعہ پورے ہو رہے تھے لیکن ظاہر ہے کہ ایک محدود پیمانہ پر۔ کیونکہ دارالعلوم کے فیض یافتہ طبقے کے علاوہ ملک کے دوسرے علمی کارکنوں کو اِس جماعت سے زیادہ دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی ۔ اشاعت تعلیم کی مساعی کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے ایک وسیع تر اجتماع کی ضرورت اِس انجمن کے بعد بھی باقی تھی۔ یہ وسیع تر اجتماع ۱۹۱۴ئ (۱۳۲۳ ف) میں "انجمن ترقی تعلیم حیدر آباد" یا "حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس" کی صورت میں نمودار ہوا ۔

"حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس" ایک طرح پر "انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم" کے سلسلہ میں قائم ہوئی ۔ کیونکہ ایک تو اس کے بانی زیادہ تر وہی حضرات تھے ، جو انجمن طلبائے قدیم کی سرگرمیوں کا بھی مرکز تھے ، دوسرے حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام سے متعلق ابتدائی اُمور پر غور کرنے کے لئے ۱۹۱۴ئ (۱۳۲۳ ف) میں ، سب سے پہلا جو اجتماع ہوا تھا ، اُس کی کارروائیوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس اجتماع کے داعی ، مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کے دِل میں دارالعلوم کی فلاح کا خیال سب سے زیادہ نمایاں تھا لیکن ابتدائی بحث و گفتگو کے بعد اِس نوزائیدہ انجمن کی جو ہئیت مرتب ہوئی وہ وسیع تر اپیل کی مالک تھی ۔

ملک کے علمی حلقوں میں "حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس" کی فوری مقبولیت اِس امر کا ثبوت ہے کہ یہ ملک کی عام ضرورت تھی ، چنانچہ اِس کے انعقاد کے

ساتھ ہی ہر طبقے اور نقطۂ خیال کے علما، اِس میں حصہ لینے اور ہاتھ بٹانے کے لئے تیار ہو گئے۔

خانگی اداروں میں، "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" کی سی وقیع اور اور سنجیدہ انجمنیں ہندوستان میں کم ہی نظر آئیگی۔ ایسے صحت بخش اصولوں سے اِس نے کام کی ابتدا کی، کہ تھوڑے ہی عرصہ میں، یہ ملک کا اہم ترین غیر سرکاری تعلیمی مرکز بن گئی۔ اس کی رائیں اور اِس کی تحریکات، عوام اور حکومت دونوں کی نظروں میں وقعت رکھتی ہیں۔ اکثر تحریکات کو حکومت نے کشادہ پیشانی کے ساتھ پسند اور منظور کیا۔ کانفرنس کی اِس کامیابی میں اِس کے اراکین اور خصوصاً اِس کے معتمد، مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کی والہانہ سعی کو بہت بڑا دخل ہے۔

کانفرنس، اپنی مساعی اور کامیابیوں کو وقفوں وقفوں سے، ملک اور عوام کے سامنے پیش کرنے کے لئے، اپنے سالانہ اجلاس منعقد کرتی ہے۔ یہ اجلاس نہ صرف بلدہ، بلکہ اہالیانِ اضلاع کی خواہش پر، اضلاع میں بھی منعقد ہوتے رہے۔ اب تک اِس طرح کے دس اجلاس ہو چکے ہیں۔

کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۹۱۵ء میں بمقام حیدرآباد (ٹاؤن ہال) منعقد ہوا۔ اِس کی صدارت، ملک کے مشہور مصلح تعلیم نواب حیدر نواز جنگ بہادر (سر اکبر حیدری)، نے کی۔ نواب صاحب اِس زمانے میں معتمد تعلیم کے

عہدہ پر فائز تھے۔ اِس اوّلین اجتماع میں کئی مفید مضامین پڑھے گئے، اور کم سے کم دس اہم تحریکیں منظور کی گئیں۔ قیام جامعہ کی تحریک جو اِس سے پہلے کئی دفعہ اُبھر اُبھر کر دب گئی تھی اِس دفعہ پھر پیش ہوئی، خود صدر اجلاس نے جو افتتاحیہ خطبہ پڑھا تھا اُس میں بھی اِس امر پر خاص زور دیا گیا تھا۔ ہندوستان اور خاص کر حیدرآباد کی اعلیٰ تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے، صاحب صدر نے نری مغربی تعلیم کے غیر تشفی بخش نتائج کو نمایاں کیا اور ملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر معین رائے کا اظہار کرتے ہوئے، حسب ذیل خیالات ظاہر فرمائے:-

> "تقریباً ایک صدی کے تجربے نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچادی ہے کہ خالص مغربی تعلیم، ہمارے ملک کے لئے مفید نہیں ہوسکتی، جس تعلیم میں ملکی ضروریات کا لحاظ نہ ہو، اور جس کی بنیاد ملکی اور قومی خصائص پر نہ ہو، وہ کوئی تعلیم نہیں۔ اِسی طرح خالص مشرقی تعلیم بھی، موجودہ زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے سودمند نہیں ہوسکتی۔ ایک، ہمیں ملک و قوم سے بیگانہ کردیتی ہے۔ دوسری، ہمیں زمانۂ حال کی ترقی اور روشنی سے محروم رکھتی ہے۔ اِس لئے ضرور، اور لابد ہے کہ دونوں کی خوبیوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔"

کانفرنس کے ایک سرگرم کارکن، مولوی محمد مظہر صاحب نے "تعلیم حیدرآباد" پر جو سیر حاصل مضمون پڑھا تھا، اُس میں اعلیٰ تعلیم کی پستی کے اسباب میں سب سے زیادہ زور اِس امر پہ دیا کہ، ہماری تعلیم کی باگ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اِس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں :-

"سب سے اہم . . . . اور سب سے پہلا کام یہی ہے کہ ایک مکمل اور قطعی نظام العمل یا پروگرام، سررشتۂ تعلیم کا مرتب ہو۔ جس میں ملکی ضرورتوں کا پُورا لحاظ رکھا جائے . . . . جس طرح برٹش انڈیا کے ہر صُوبے کی تعلیمی حالتیں و ضرورتیں۔ باہم مختلف ہیں، اور اِس کے لحاظ سے علٰحدہ علٰحدہ نظام العمل رکھنا پڑتا ہے، اِسی طرح ہماری سلطنت کی تعلیمی حالت اور ضروریات ایسے ہیں جو کسی ایک خاص صوبہ برٹش انڈیا سے مطابقت نہیں رکھتے . . . . یہ امر کہ سررشتۂ تعلیم، حیدرآباد کی بنیاد ملک کی ضرورتوں پہ رکھی جائے، کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ اِس کا پتہ اس وقت سے چلتا ہے جب کہ بتیس سال قبل بصدارت حضرت غفراں مکاں، اسی باغ عام میں ایک دارالفنون قائم کرنے کے مسئلہ پر غور و خوض

ہوا تھا۔ ہمارے ملک کی حالت کا اقتضا یہ ہے کہ فی الحال
اُن متعلموں کی تعلیم، جو ابتدائی درجہ پر ختم ہو جانے والی
ہو، اُن کی مادری زبان میں دی جائے، اور ساتھ ہی
اُردو کی تعلیم بھی اُن کو دی جائے۔ جن طلباء کا منشاء ثانوی تعلیم
سے آگے بڑھنے کا نہیں، اُن کی تعلیمی پہلی زبان اُردو رہنی
چاہیئے۔ اور جس قدر تعلیم علوم مثل حساب، ریاضی، تاریخ
جغرافیہ، طبیعیات وغیرہ اُن کو دی جائے، وہ بھی اُردو
ہی میں رہے۔ ساتھ ہی ساتھ انگریزی لٹریچر کی تعلیم لازمی
رہے۔"[1]

اِسی اجلاس میں مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقیٔ اُردو نے
بھی اُردو میں علوم و فنون کے تراجم کی شدید ضرورت پر پُرمغز تقریر کی اور
حکومت کی توجہ اِس طرف منعطف کرنے کی تحریک پیش کی تھی، جس کی
پُرزور تائید بابو گیا پرشاد وکیل نے کی۔ یہ دونوں تحریکیں جس قدر جلد
بار آور ہوئیں اس سے کانفرنس کی رائے کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔
مستحق طلبہ کو 'وظائف' کے ذریعہ امداد دینے کی ایک تیسری تحریک

---

[1] روداد "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" اجلاس اول (۱۹۱۵ء) صفحہ ۱۲۷ و صفحہ ۱۲۹

پیش ہوئی تھی۔ جس کو کانفرنس نے فوراً منظور کرلیا۔ اور بڑی جانفشانی سے ایک وظیفہ فنڈ نہایت صحت بخش اصول پر قائم کیا۔ اِس فنڈ سے غیر مستطیع طلبہ کو تعلیمی وظیفے دئے جاتے ہیں اور آج تک سینکڑوں طلبہ اِس امداد سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔

اِس وقت تک کانفرنس نے مختلف اوقات میں دس سالانہ اجلاس کئے۔ جن میں سے تین، یعنے دوسرا، پانچواں اور چھٹا علی الترتیب اورنگ آباد، لاتور اور پربھنی میں منعقد ہوئے اِس سے اضلاع میں اشاعتِ تعلیم اور تعلیمی دلچسپی پیدا کرنے کے ایک ضروری مقصد میں کانفرنس کو بڑی کامیابی ہوئی۔

اِن سالانہ جلسوں میں حقیقی مفید اور علمی تحریکیں منظور ہوئیں، اور اُن کو روبراہ لانے میں کانفرنس نے جو کوششیں کیں۔ اُن کی تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں۔ ممالک محروسہ کی تعلیم کے تقریباً ہر پہلو پر ان جلسوں میں اظہارِ خیال کئے گئے اور جو تحریکیں منظور ہوئیں، اُن کو آگے بڑھانے میں کانفرنس نے اپنے تمام وسائل سے کام لے کر، تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کی فضا کو تعلیمی دلچسپیوں سے روشناس کردیا۔ اِس وقت خوش نصیبی سے کانفرنس کو مولوی سید خورشید علی صاحب جیسے ہردلعزیز اور پبلک خدمت گزار معتمد کی خدمات حاصل ہیں صاحب موصوف کے اہتمام میں کانفرنس بغیر شور وشغب کے

اپنا کام انجام دے رہی ہے۔ ہر سال بیسیوں غیر مستطیع طالب علم کانفرنس کے وظیفہ سے امداد حاصل کرکے، تعلیم جاری رکھنے کے قابل بن رہے ہیں۔

جس وقت کانفرنس قائم ہوئی تھی، ملک میں کوئی عام علمی یا تعلیمی مرکز موجود نہیں تھا۔ اسی لئے بسا اوقات کانفرنس کو، تعلیم کے علاوہ دوسرے علمی، اقتصادی یا سماجی مسائل کو بھی سمیٹنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن، چند سال سے، ملک کو ایک ٹھیٹ اور خصوصی جماعت یعنی "انجمن اساتذہ حیدرآباد" کی خدمات حاصل ہوگئی ہیں، جو کارگزاری، کے اعتبار سے اپنی نوعیت کی مفیدترین انجمن ثابت ہوچکی ہے۔ دوسری طرف "انجمن طیلسانیین عثمانیہ" نے تعلیمی اور علمی معاملات کے علاوہ، سماجی، اقتصادی اور شہری خدمات کو بھی اپنے ذمہ لے رکھا ہے اور نہایت خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دے رہی ہے۔ ان انجمنوں کے قیام کے باعث کانفرنس کا بار کچھ ہلکا ہوگیا ہے، پچھلے چند سال سے اس کے اجلاس وقفوں سے منعقد ہو رہے ہیں، اور ان کی کارروائیوں کی نوعیت بھی زیادہ علمی ہوگئی۔

۶

جامعۂ عثمانیہ

حیدرآباد میں ایک جامعہ کا قیام، ایک سرپرست علوم اور ایک معمار کا منتظر تھا۔ نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کی عرضداشت۔ فرمان عطوفت نشان۔ جامعۂ عثمانیہ کی امتیازی خصوصیات۔ دارالترجمہ کا قیام۔ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کا افتتاح۔ دارالعلوم کالج کا انضمام جامعہ کے شعبوں کی تکمیل۔

جامعۂ عثمانیہ

عہدہ دارانِ تعلیمات اور مفکرین ملک کے ذہن میں ، حیدر آباد کے لئے ایک جامعہ کا خیال اور اس جامعہ کے اجزائے ترکیبی کا دھندلا سا تصور، اس میں شک نہیں کہ عرصہ پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن تصور کو مجسم شکل دینے اور عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک روشن خیال سرپرستِ علوم حکمران اور ایک ہوشیار معمار کی ضرورت تھی۔ یہ سرپرست اور یہ معمار ، موجودہ صدی کے ابتدائی دس سال ختم ہونے سے پہلے ظہور پذیر نہ ہو سکے۔

موجودہ اعلیٰ حضرت کے عہدِ حکومت کے ابتدائی چند سال، اس تعلیمی کش مکش کے مشاہدے میں گزرے جن کا پچھلے ابواب میں ذکر ہو چکا ہے۔ آٹھ نو سال تک ملک کا تعلیمی نظام درست کرنے کی مسلسل سعی کے دوران میں اعلیٰ حضرت کی حکومت نے آخر کار ایک صحت بخش نظام تعلیم کے تصور کو نشو و نما دے لیا۔ اور اس تصور کو منصۂ شہود پر لانے میں اُس زمانہ کے معتمد تعلیم،

نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے اولین معمار کا کام کیا۔ ملک کی تعلیمی ضروریات کے متعلق ایک مفصل عرضداشت مرتب کرکے، نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے بارگاہ اعلیٰحضرت میں پیش کی۔ اِس عرضداشت میں "مروجہ غیر متجانس تعلیم کے مضراثرات تفصیل سے دکھائے گئے تھے۔ اور ممالک محروسہ سرکار عالی کے لئے ایک جامعہ کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی جو ملک ہی کی ایک زبان یعنے اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنائے۔"

اعلیٰ حضرت نے اِس عرضداشت کو شرف قبولیت بخش کے، اِس امر کا ثبوت دیا کہ آپ کو ممالک محروسہ کی علمی ترقی کا پیش از پیش خیال ہے۔ اِسی موقع پر وہ فرمان مبارک شرف صدور لایا جس کا عہد آفریں اثر رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔

"مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کی مصرحہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اِس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام کے نقائص دور ہوکر، جسمی اور دماغی اور روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے۔ اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق

کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی ہو سکے۔

اِس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اُردو قرار دی جائے۔ اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازم گردانی جائے۔ لہٰذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکورۂ اصول محولہ عرضداشت کے مطابق ممالک محروسہ کے لئے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اِس یونیورسٹی کا نام "عثمانیہ یونیورسٹی" حیدرآباد ہوگا۔"

منشور خسروی جامعہ عثمانیہ ۲۹ ذولحجہ ۱۳۳۶ھ م ۱۳۲۷ف م ۱۹۱۸ء کو شرف صدور لایا اور اِس کے ساتھ ہی عہدہ داران محکمہ تعلیمات نے جامعہ کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ابتدا امور کا سرانجام شروع کیا۔ نئی جامعہ کی ہئیت مدون کی گئی، اور نصاب مرتب کرنے کے لئے کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ اور نصاب کے جو مسودے تیار ہوئے، وہ ہندوستان اور انگلستان کے تعلیمی حلقوں میں گشت کرائے گئے، اور جب ماہران تعلیم نے اِس اصول کے ساتھ اتفاق کیا اور جامعہ کی اسکیم کو پسند کیا تو "بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا" کہہ کر

اس کی بنیاد رکھ دی گئی ۔

بالآخر، حضرت غفراں مکاں، نواب سر سالار جنگ بہادر، علامہ شبلی نواب عماد الملک بہادر، ملا عبدالقیوم مرحوم مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم، اور مسٹر آرتھر میو کے خواب کی تعبیر پوری ہو گئی ۔

اہلِ ملک نے جامعہ کا نہایت جوش سے خیر مقدم کیا۔ کیونکہ یہ اُن کی دیرینہ توقعات کا مجسمہ تھی۔ عرصہ سے وہ اِس کا خواب دیکھتے آ رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کی طرف اُسی شوق سے بڑھنے لگے جس شوق سے ایک تشنہ لب ایک سلسبیل کی طرف بڑھتا ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کا قیام حیدرآباد میں تعلیم کے جدید ترین نظریہ سماجی کا حل تھا۔

"جامعۂ عثمانیہ کے نصابِ تعلیم کی بڑی خصوصیات یہ ہیں کہ میٹرکیولیشن میں مضامین دو گروپوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، تاکہ طلبہ جو مضامین کالج میں لینا چاہیں، ان میں اُن کی ابتدائی تعلیم اچھی ہو۔ انٹرمیڈیٹ میں انتخابِ مضامین، میں بہ نسبت اور یونیورسٹیوں کے زیادہ وسعت رکھی گئی ہے اور مضامین کو اِس طرح سے مرتب کیا ہے کہ ایک طالب علم اپنے لئے ایک ایسا مجموعہ اختیار کر سکتا ہے جس کے مضامین ایک دوسرے سے قریب کا تعلق رکھتے ہوں۔ مختلف مجموعوں میں مضامین کی تقسیم سے یہ فائدہ ہے کہ بی، اے کی جماعتوں میں ایک طالب علم کسی خاص مضمون اور اُس کے

متعلقات کی تعلیم مکمل طریقے پر حاصل کرسکتا ہے۔ انگریزی زبان اور دینیات یا اخلاقیات کے علاوہ جو لازمی مضامین ہیں، طالب علم کوئی دوسرا مضمون ایسا لے سکتا ہے، جس میں خصوصیت کے ساتھ وہ تمام وکمال عبور حاصل کرلے اور پھر اسی مضمون پر تحقیق وتلاش کے کام میں مصروف ہوجائے۔۔۔۔۔ دینیات یا اخلاقیات کالج کی، تمام جماعتوں کے لئے لازمی ہے۔۔۔۔۔ انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔ اِس کا معیار وہی رکھا گیا ہے جو دوسری یونیورسٹیوں کا ہے۔ اِس کی وجہ سے جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ انگریزی بولنے والی دنیا کے خیالات سے آشنا رہ سکتے ہیں"۔ اِن کا دائرۂ عمل جامعہ کی مطبوعہ یا مشروط کتابوں تک محدود نہیں ہے۔ وہ اپنے مضامین میں انگریزی کتابوں سے بھی ہر وقت استفادہ کرسکتے ہیں:" یہی امتیازی خصوصیات ہیں جن کی بدولت جامعۂ عثمانیہ نہ صرف حیدرآباد، بلکہ ہندوستان بھر میں مقبول ہوئی اِس کی پیداوار مشرق اور مغرب کا بہترین آمیزہ ہے۔

جامعہ کی مکمل تشکیل کو تقریباً بارہ سال کا عرصہ لگا۔ بارگاہِ جہاں پناہی سے قیام جامعہ کی منظوری عطا ہوتے ہی، سب سے پہلے، درسی کتابوں کی تیاری کے لئے شعبۂ دارالتصنیف وترجمہ کا قیام عمل میں آیا۔ جہاں انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں کی کتابیں ترجمہ کے ذریعہ اردو میں منتقل کی جانے لگیں۔ اصطلاحات کی دقتیں، وضع اصطلاحات کی کمیٹی کے ذریعہ رفع کی

گئیں۔ اس کمیٹی نے اب تک مختلف فنون کی ہزاروں علمی اصطلاحات وضع کی ہیں۔ جن میں سے اکثر عام طور پر اردو زبان میں استعمال ہونے لگی ہیں۔

دارالترجمہ کے قیام کے ساتھ ہی، دارالعلوم میں میٹریکولیشن کی جماعت بھی کھولدی گئی۔ ۱۹۱۹ء ۱۳۲۲ف میں جامعۂ عثمانیہ کا پہلا امتحان میٹرک منعقد ہوا جس میں (۵۲۳) امیدوار شریک تھے۔ اتنی کثیر تعداد، اس درجے کے امتحانات کی تاریخ میں یہاں پہلی دفعہ دیکھی گئی۔ اس سے پہلے مدراس میٹرک یا ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کے امتحانات کے شرکاء کی تعداد زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سو ہوتی تھی۔

کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کا افتتاح ۲۸ مہر ۱۳۲۸ف م اگسٹ ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ اس کے افتتاح کے بعد دارالعلوم کالج شعبۂ دینیات کی صورت اختیار کرکے جامعۂ عثمانیہ میں ضم ہو گیا نواب مسعود جنگ بہادر، ناظم تعلیمات، عارضی طور پر کالج کے صدر مقرر ہوئے

جامعۂ عثمانیہ کا پہلا امتحان بی، اے ۱۹۲۲ء ۱۳۳۲ف میں منعقد ہوا اور (۲۰) طلبہ کامیاب ہوئے۔ حیدرآباد کی تاریخ میں یہ پہلا خوش قسمت سال تھا کہ بہ یک وقت اُسے اتنے طیلسانی میسر آئے ۱۹۲۵ء ۱۳۴۴ف تک کلیہ کی جماعتیں مکمل ہوگئیں۔ اور انٹرمیڈیٹ سے لے کر، ام۔ اے اور ال ال، بی تک تعلیم جاری ہوگئی۔ کلیہ نے تکمیل کے یہ آخری مراحل، پروفیسر عبدالرحمان خاں صاحب کی صدارت میں ختم کئے۔ جن کا تقرر اعلیحضرت سلطان العلوم نے اپنے فرمان عطوفت نشان کے ذریعہ ۱۳۳۲ف میں فرمایا۔ یہ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کے نشوونما

کا دَور تھا، اِس عرصہ میں سائنس کے معمل منظم ہوئے کلیہ کی روایات قائم ہوئیں اور یہ تجربے کے ابتدائی مراحل سے گزر کر کامیابی کی منزل تک پہنچ گیا۔ پروفیسر عبدالرحمٰن خاں صاحب سے پہلے، مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی، نے بھی کلیہ کی صدارت کی خدمت دو سال تک انجام دی تھی نواب مہدی یار جنگ بہادر، (صدرالمہام سیاسیات) کا تعلق بھی اس عہدے سے چند مہینوں کے لئے رہ چکا ہے۔

کلیۂ جامعۂ عثمانیہ میں طلبہ کی کثرت کے مدِنظر اور اضلاع میں اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں پیدا کرنے کے مقصد سے ۱۳۳۲ھ ف میں، مدرسہ فوقانیہ انگریزی بلدہ اور مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد میں بھی انٹرمیڈیٹ کی جماعتیں کھولی گئیں اس کے دوسرے سال زنانہ ہائی اسکول، نامپلی کلیۂ اناث بنا دیا گیا۔ ۱۹۲۷ء ۱۳۳۶ھ میں، مدرسۂ فوقانیہ ورنگل اور مدرسۂ فوقانیہ گلبرگہ کو بھی، عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج کا رتبہ عطا کیا گیا، اس طرح نو سال کے اندر ممالک محروسہ کے تمام صوبوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ممکنہ سہولتیں مہیا ہو گئیں۔

فنون، دینیات اور قانون کے شعبے مکمل ہوتے ہی، فنی کالجوں کے قیام کا بیڑا اٹھایا گیا۔ اور سب سے پہلے ۱۳۳۶ھ ف میں عثمانیہ میڈیکل اسکول کو کالج کے درجے تک ترقی دے کر، ام، بی، بی ایس کی تعلیم کا آغاز کیا گیا دوسرے سال سول انجینیرنگ اسکول کو کلیہ انجنیری میں تبدیل کر کے جامعہ سے ملحق

کر دیا گیا ۔ ۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء میں مدرسۂ تعلیم المعلمین بلدہ کو بی ٹی کی تعلیم کے لئے کالج کے رتبہ تک ترقی دی گئی ۔ غرض ۱۹۲۹ء تک جامعۂ عثمانیہ میں فنون، دینیات طب، انجنیری اور تربیت معلمین کے شعبے قائم ہو گئے ۔

تین چار سال ہوئے کہ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ میں مابعد بی، اے یا ام، آے تحقیقاتی کام بھی جاری کیا گیا ہے۔ کلیہ کے قابل ترین فارغ التحصیل طلبہ کی ایک خاصی جماعت ہر سال ، ادب ، تاریخ ، فلسفہ ، دینیات ، عربی ، فارسی ، اُردو ، مرہٹی ، تلنگی اور کنڑی میں اعلیٰ تحقیقاتی کام کے قابل بنائی جا رہی ہے اِن کے کام وقتاً فوقتاً منظر عام پر بھی آتے رہتے ہیں ۔

جامعہ کا قیام یوں تو ہر مُلک میں ، اہلِ ملک کے اعلیٰ ذہنی نشو و نما کا ضامن ہوتا ہے لیکن جتنی قلیل مدت میں جامعہ عثمانیہ نے یہ سارا ہنگامہ برپا کر دیا ، اس کی مثال کسی ہندوستانی جامعہ کی تاریخ میں مشکل سے ملیگی لیکن یہ کوئی آسمانی کرشمہ بھی نہیں ہے بلکہ دیسی اور ملکی زبان میں تعلیم دینے کا مسلّمہ اور متوقع نتیجہ ہے ۔

اُردو ذریعۂ تعلیم

حیدر آباد دکن سے اُردو کا تعلق۔ حیدر آباد کی تعلیم اور اُردو ۔ مسٹر ہڈسن کی رائے اُردو کے متعلق۔ مقامی زبانوں کے ساتھ حکومت کا منصفانہ سلوک متعلمین السنہ کا پچیس سالہ تختہ ۔ تختہ مدارس، طلبہ اور مصارفِ سالانہ ۔

اُردو ذریعۂ تعلیم

جس طرح جامعۂ عثمانیہ کوئی پیدا کی ہوئی چیز نہیں ہے، بلکہ ملک کے گزشتہ تعلیمی حالات کی بتدریج ارتقا یافتہ شکل ہے، اسی طرح ذریعۂ تعلیم کا انتخاب بھی حیدرآباد کے لئے ایک تاریخی اور علمی اہمیت رکھتا ہے۔ آغازِ کار کے وقت طرح اندازانِ جامعہ کے پیش نظر، یہ دونوں چیزیں تھیں۔

حیدرآباد اس زبان سے جو کبھی دکھنی کہلاتی تھی اُس وقت روشناس ہوا جب علاؤالدین خلجی کی فتحمند فوجیں پہلے پہل دیوگڑھی اور دولت آباد میں داخل ہوئیں۔ (۶۹۵ھ) سلطان علاؤالدین حسن گنگو بہمنی نے جب دکن میں مستقل سلطنت قائم کر لی، تو یہاں اس زبان کے نشو و نما کے لئے وسیع مواقع فراہم ہو گئے۔ چنانچہ تھوڑے عرصہ کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس زبان کو عوام میں خاصی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ حکومت کی زبان تو بلاشبہ فارسی ہی تھی لیکن، عوام خصوصاً وہ لوگ جو مختلف زبانیں بولتے تھے، لیکن تجارت،

ملازمت، اقامت غرض کسی وجہ سے بھی ایک جگہ رہنے اور تبادلۂ خیال کرنے پر مجبور رہتے تھے، اسی زبان میں بات چیت کیا کرتے تھے مختلف زبانوں کا آمیزہ ہونے کے سبب اس زبان میں صلاحیت تھی کہ ہر شخص اپنی زبان کے الفاظ اس میں شامل کر کے مافی الضمیر کو ادا کر دیتا، اس ایک خصوصیت کے سبب اس زبان کا سیکھنا بھی دشوار نہیں تھا۔ موجودہ زمانے کی طرح اس زمانے میں بھی، بازاروں، مجمعوں اور صحبتوں میں، جن کا ہندوستان جیسے کثیر الالسنہ ملک میں، ایک سے زیادہ زبانیں بولنے والوں پر مشتمل ہونا، ناگزیر ہے، یہ بولی بغیر کسی کوشش اور دقّت کے سیکھ لی جا سکتی تھی۔

یہ زبان ہندوستان بھر میں بولی جاتی تھی، لیکن تصنیف و تالیف میں استعمال ہونے کا شرف اس کو سب سے پہلے دکن میں حاصل ہوا۔ عہد بہمنی ہی میں اکثر دکنی مصنفین، فارسی کے بجائے، اسی زبان میں تصنیف و تالیف کرنے لگے تھے۔ وہ مصنفین جن کے لئے فارسی میں تصنیف و تالیف کرنا زیادہ آسان تھا، دکنی اُردو میں کتابیں لکھنے کو کبھی ترجیح نہیں دے سکتے تھے، جب تک کوئی شدید ضرورت اُن کو اِس بات پر مجبور نہ کرتی ہو۔ اِس خاص واقعہ سے یقیناً اِس بات کا پتہ چلتا ہے کہ نویں صدی ہجری ہی میں یہاں کے لوگ فارسی سے زیادہ دکنی اُردو کو سمجھ سکتے تھے۔

تصنیف و تالیف شروع ہونے کے بعد، یہ زبان رفتہ رفتہ یہاں

علمی اور ادبی حیثیت اختیار کرتی گئی۔ چنانچہ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے زمانۂ عروج، یعنے گیارھویں صدی ہجری کی ابتدا تک اس زبان میں شاعرانہ، فلسفیانہ اور متصوفانہ خیالات کے اظہار کی کافی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ شمالی ہند میں ابھی تک علمی زبان فارسی تھی۔ اور اُردو میں تصنیف و تالیف کا خیال کسی کے دل میں بھول کر بھی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتوں کے عروج کے ساتھ، دکنی اُردو کو بھی عروج ہوا۔ بیسیوں دکنی شاعر اور انشا پرداز، اِن دونوں سلطنتوں کے سایۂ عاطفت سے اٹھے، اور اِس زبان کو خوب ترقی دی اور ہر طرح کے خیالات کا آلہ بنایا۔ اِس کا اثر اِس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ فارسی زبان سوائے دفتری ضرورتوں کے بہت کم اِستعمال ہوتی تھی۔ خود حکمران اپنی خانگی زندگی میں اِسی زبان کو اِستعمال کرتے تھے، سلاطین بہمنیہ نے شاہی دفتر اِسی زبان میں کر دئے تھے[1]۔ آخر وہ دن بھی آیا کہ بیجاپور میں بھی ابراہیم عادل شاہ اول (۹۴۱ھ سے ۹۶۵ھ) نے اسے عوام کی بولی کے درجے سے بڑھا کر سلطنت کی زبان اور دفتری زبان بنا دیا۔ گولکنڈے کے حکمرانوں نے بھی اس زبان میں اپنے آثار چھوڑنے کو باعثِ فخر سمجھا۔

---

[1] "اُردوئے قدیم" مطبوعہ رسالۂ "تاج" حیدرآباد دکن صفحہ ۱ سنہ ۱۹۲۵ء۔

سلاطین آصفیہ، شمالی ہند کی تمدنی اور شائستگی کی زبان، فارسی اپنے ساتھ لائے تھے لیکن وہ بھی بہت جلد اِس زبان کے اثرات سے مغلوب ہو گئے اور اِسکی سرپرستی کو اپنا فرض تصور کرنے لگے۔

حیدرآباد کی تعلیمی ترقی میں اُردو کا تقریباً ایک صدی کا ساتھ ہے۔ "مدرسہ شجاعیہ" موقوعہ جامع مسجد حیدرآباد، "مدرسۂ فخریہ"، اور سب سے آخر "مدرسۂ دارالعلوم" میں یہی زبان درس و تدریس اور افہام و تفہیم کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔

"مدرسۂ شجاعیہ" کی حد تک اِس امر کا ثبوت، بانیٔ مدرسہ، مولنا حافظ شجاع الدین کے اُن رسائل سے ملتا ہے، جو متعلمین مدرسہ کے استفادے کے لئے لکھے گئے تھے۔ اِن میں سے ایک رسالہ "کشف الخلاصہ" حال تک بھی ممالک محروسہ کے مدارس میں شریک نصاب تھا۔ "مدرسۂ فخریہ" کے عالم اور علم پرور موسس نواب فخرالدین خاں بھی خود اپنے قلم سے، اِس کا ثبوت چھوڑ گئے ہیں۔ اِن کی مصنفہ اُردو کتابیں "ستۂ شمسیہ" وغیرہ، مدرسہ کے طلبہ ہی کے لئے لکھی گئی تھیں۔ اِس خاندان کے درباری مورخ، مولانا امام خاں نے اپنی "تاریخ خورشید جاہی" میں جہاں یہ لکھا ہے کہ ممدوح نے جو کتابیں علوم ہئیت، کیمیا، فلسفہ وغیرہ پر خود تصنیف کیں یا دوسرے علما سے لکھوائیں وہ "مدرسۂ فخریہ" میں پڑھانے کے لئے تھیں، اِسی سلسلہ میں وہ ایک اور کام کی بات

یہ بتلاتے ہیں کہ، یہ کتابیں گو کثیر تعداد میں چھپی تھیں، لیکن بلدہ کے دوسرے مدارس کے طلبہ نے ہاتھوں ہاتھ اڑالیں۔ "مدرسہ دارالعلوم" کے سینکڑوں فارغ التحصیل اب بھی موجود ہیں جن سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ مدرسہ کی نصابی کتابیں گو فارسی اور عربی تھیں، لیکن اِن کی تفہیم اور تشریح عام طور سے اُردو زبان میں کی جاتی تھی۔ اضلاع کے مدارس میں بھی، جہاں ضرورت پڑتی، کتاب کے متن کی تشریح، اِسی زبان میں کی جاتی تھی۔

حضرت ناصر الدولہ بہادرؒ کے عہد میں حکومت نے سب سے پہلے جو مدرسۂ طبابت بلدہ میں قائم کیا تھا، وہ ڈاکٹری جیسے عملی فن کی تعلیم اُردو میں دیتا تھا۔ نعمان الدولہ مرحوم اور ڈاکٹر عبدالحسین ارسطو یار جنگ جیسے قابل اہل فن اِسی تعلیم کی پیداوار ہیں۔

مذکورۂ بالا تمام اُمور کے علاوہ، صدیوں سے اُردو زبان حیدرآباد کی سوسائٹی کی زبان، شائستگی اور تمدن کی زبان بنی ہوئی ہے۔ نصف صدی سے اس کو دفتری زبان بننے کا بھی امتیاز حاصل رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں، زندگی کے ہر شعبے میں اِس کے استعمال نے، اِس میں ہر طرح کے خیالات ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ لوچ اور لچک یوں بھی اِس کی سرشت ہے جس کی بدولت فارسی اور عربی جیسی غیر متجانس زبانوں کے الفاظ اِس میں اِس طرح سما گئے ہیں کہ ان میں سے اکثر اِس کا جزِ بدن بن گئے ہیں۔ موجودہ زمانے میں

مغربی زبانوں کے الفاظ اس میں راہ پانے لگے ہیں۔ اور سب کے لئے اس کی لچک نے گنجایش پیدا کردی ہے۔

اُردو زبان کی یہ ایسی خصوصیات ہیں کہ جب انگریز پہلے پہل ہندوستان میں آئے، تو انہیں یہاں کی بے شمار زبانوں میں سب سے زیادہ کارآمد یہی زبان نظر آئی۔ کیونکہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے درمیان یہی ایک مشترک بولی ہے۔ اور اِسی لئے، جہاں دوسری زبانوں پر حدودِ ارضی کی قیود عائد ہیں، یہ صوبۂ سرحدی سے لیکر راسِ کماری تک، اور بلوچستان سے لے کر آسام اور برما تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان کے بازار پر تو اسی کا قبضہ ہے، انہیں سہولتوں کے مدنظر ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز عہدہ داروں نے کلکتہ کا مشہور مدرسہ عالیہ قائم کرکے اس کی سرپرستی کی۔ اور اِس طرح وہ جدید اُردو نثر کے معماروں میں شمار ہو سکے۔

۱۳۱۰ف ۱۸۹۲ء میں مدرسۂ عالیہ کے رپورٹ کے ضمن میں مسٹر ڈسن، پرنسپل نظام کالج، نے حیدرآباد میں اور باہر اُردو کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے، اس کی تعلیم کی طرف سے محکمۂ تعلیمات کی بے توجہی کی شکایت اِس طرح کی ہے:-

"اُردو کو اُس کے شایانِ شان اہمیت نہیں دی جاتی۔ حالانکہ یہ ہندوستان بھر میں، مسلمانوں کے علاوہ کئی ملین ہندوؤں کی مادری زبان ہے۔"

نواب عماد الملک، مسٹر ہڈسن کی رائے کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔ "مدرسہ کے کمسن بچوں کو معمولی مضامین کے علاوہ تین تین زبانیں سکھا کر پریشان کرنا نامناسب ہے۔ اِس لئے میرا خیال ہے کہ کنڈر گارٹن، اور مدرسہ کی دو ابتدائی جماعتوں میں تعلیم صرف انگریزی اور اُردو تک محدود کر دی جانی چاہیئے۔ دوسری مقامی زبانیں اعلیٰ ترمرحلے پر سکھائی جاسکتی ہیں۔"[1]

حیدرآباد کی تعلیم کے لئے ایک صدی سے زیادہ کی یہ ایسی تاریخ تھی کہ اس کے موجود ہوتے ہوئے، جدید جامعہ میں فطرتاً کوئی دوسری زبان ذریعۂ تعلیم نہیں بن سکتی تھی۔ چنانچہ موسّسینِ جامعہ نے ماضی کے ان کامیاب تجربوں کا کما حقہ لحاظ رکھا۔ اور اسی کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دیا۔

اُردو کے علاوہ مقامی زبانوں میں مرہٹی، تلنگی اور کنڑی کو بھی ذریعۂ تعلیم بننے کا حق حاصل ہے لیکن بیک وقت سب استعمال نہیں کی جاسکتیں ان میں سے کسی نہ کسی کو دوسری پر ترجیح دینی پڑے گی۔ اور یہ ترجیح بلا مرجح ہوگی۔ ورنہ حیدرآباد میں ایک کی جگہ چار بلکہ پانچ جامعات قائم ہوجائیں گی۔

حکومت کو بہرحال کسی ایک زبان کو اختیار کرنا تھا۔ نظرِ انتخاب فطرتاً دفتری زبان کی طرف اٹھی۔ لیکن دوسری مقامی زبان بولنے والوں کے ساتھ

---

[1] رپورٹ نظم و نسق سررشتہ تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی بابتہ ۱۳۲۹ھ مرتبۂ نواب عماد الملک بہادر مرحوم

بھی انصاف شرط ہے۔ اس کا انتظام یہ کیا گیا کہ ابتدائی تعلیم بچے کی مادری زبان میں دی جاتی ہے۔ اوپر کے درجوں سے اردو بھی لازمی زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ اور جو طلبہ مقامی السنہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں، اعلیٰ جماعتوں میں اُن کے لئے کافی گنجایش موجود ہے،

مذکورۂ بالا سہولتوں کے علاوہ حکومت نے ان طلبہ کے لئے جو اُردو میں تعلیم پانا نہ چاہتے ہوں۔ نظام کالج کی درسگاہ بھی بصرف کثیر قائم رکھی ہے فوقانی درجوں سے وہ، اپنے آپ کو نظام کالج کے لئے تیار کر سکتے ہیں۔

نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے، جن کو جامعہ عثمانیہ کے اُصول کامل پر ایقان اور اِسی لئے جامعہ کے ساتھ عشق ہے تقسیم اسناد کے موقع پر عثمانیہ طیلسانیین کو جو خطبہ دیا تھا، اِس میں صاف طور پر حکومت کی اِس آمادگی کا اظہار فرما دیا ہے کہ، اگر مقامی السنہ میں سے کسی زبان کی جامعہ قائم ہونے لگے، تو اعلیٰ حضرت بندگان عالی کی حکومت اِس میں حتی الامکان مدد دینے کو تیار ہے۔

اِس سلسلے میں گزشتہ پچیس سال میں ممالک محروسہ کی مقامی زبانوں کے علاوہ اُردو اور انگریزی زبانوں کے متعلمین کے جو اعداد رہے ہیں، اُن کا ایک تختہ دیا جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ اِس سے اِس مسئلہ پر مزید روشنی پڑے گی۔

سنہ	اردو	مرہٹی	تلنگی	کنڑی	انگریزی
۱۳۱۵ف سنہ ۱۹۰۶ء	۲۶,۲۸۵	۱۷,۷۵۶	۱۳,۰۹۸	۳,۹۲۴	۸۵۸۲
۱۳۱۶	۲۷,۶۵۶	۱۷,۲۷۲	۱۳,۶۷۱	۴,۵۴۱	۸۰۳۱۰
۱۳۱۷	۳۶,۴۲۹	۱۶,۹۳۳	۱۳,۶۱۷	۴,۵۰۴	۸,۶۷۵
۱۳۱۸	۲۵,۰۵۲	۱۲,۰۵۹	۱۴,۲۸۱	۴,۴۶۲	۹,۸۱۹
۱۳۱۹	۲۵,۹۵۱	۱۸,۵۳۳	۱۵,۹۱۰	۳,۵۳۰	۱۲,۶۰۵
۱۳۲۰	۳۶,۰۷۲	۱۷,۳۰۷	۱۵,۳۵۳	۳,۵۴۴	۱۲,۴۴۶
۱۳۲۱	۲۷,۲۳۲	۱۸,۲۴۷	۱۵,۵۹۷	۴,۴۳۷	۱۱,۸۷۴
۱۳۲۲	۲۷,۶۸۰	۱۸,۴۵۴	۱۵,۲۷۸	۳,۲۴۰	۱۳,۷۰۹
۱۳۲۳	۳۳,۷۲۱	۱۸,۳۵۵	۱۶,۸۵۳	۳,۸۹۹	۱۴,۰۱۱
۱۳۲۴	۴۱,۵۷۰	۲۲,۳۵۸	۱۸,۷۰۸	۴,۴۶۴	۱۲,۰۵۸
۱۳۲۵	۴۳,۵۷۴	۳۲,۹۷۷	۲۱,۱۰۰	۵,۷۰۹	۱۱,۲۹۹
۱۳۲۶	۶۵,۲۸۳	۳۴,۷۵۷	۴۲,۶۲۶	۸,۵۲۷	۱۳,۵۶۵
۱۳۲۷	۸۳,۸۵۱	۴۶,۳۳۰	۶۰,۰۸۹	۱۳,۵۹۰	۱۵,۴۱۳
۱۳۲۸	۹۱,۱۷۱	۵۰,۱۲۴	۵۸,۳۸۱	۱۰,۸۳۴	۱۶,۳۲۴
۱۳۲۹	۹۹,۵۱۸	۵۶,۴۰۴	۶۸,۸۱۲	۱۴,۱۱۹	۱۸,۵۰۵

سنہ	اُردو	مرہٹی	تلنگی	کنڑی	انگریزی
سنہ ۱۳۳۰ ف / ۱۹۲۰ء	۱,۱۱,۲۵۷	۵۹,۹۸۵	۸۲,۰۰۰	۱۵,۵۱۹	۱۹,۲۰۵
۱۳۳۱	۱,۲۰,۱۱۳	۶۲,۴۹۷	۸۵,۱۳۵	۱۶,۲۴۲	۲۳,۳۳۱
۱۳۳۲	۱,۲۱,۷۵۴	۶۲,۰۱۰	۸۱,۳۲۳	۱۷,۲۳۶	۲۵,۴۲۶
۱۳۳۳	۱,۲۹,۲۱۴	۶۴,۵۲۶	۸۱,۲۵۳	۱۸,۰۵۱	۲۷,۱۷۸
۱۳۳۴	۱,۳۰,۹۸۷	۶۴,۷۹۱	۸۱,۳۵۹	۲۰,۴۷۷	۲۹,۵۶۸
۱۳۳۵	۱,۳۲,۳۴۳	۶۲,۳۵۹	۸۰,۹۳۵	۲۲,۷۴۴	۳۰,۰۳۵
۱۳۳۶	۱,۳۷,۲۹۱	۶۶,۷۷۴	۹۰,۸۸۸	۲۴,۸۳۵	۳۲,۴۴۴
۱۳۳۷	۱,۴۰,۸۸۳	۶۸,۹۱۶	۹۷,۱۴۱	۲۶,۲۴۶	۳۴,۷۸۱
۱۳۳۸	۱,۴۸,۶۵۸	۷۱,۳۸۱	۹۸,۴۷۱	۲۵,۶۵۱	۳۶,۳۵۲
۱۳۳۹	۱,۴۸,۲۱۶	۷۱,۳۶۳	۱,۰۰,۳۸۱	۲۵,۵۱۲	۳۸,۷۰۴
۱۳۴۰	۱۴۹,۳۲۰	۷۱,۵۱۴	۱,۰۲,۳۳۴	۲۵,۶۰۸	۳۸,۸۳۰
۱۳۴۱	۱,۵۳,۵۸۱	۷۷,۰۳۷	۱,۰۶,۸۲۰	۲۵,۶۲۲	۴۴,۹۱۳
۱۳۴۲ / ۱۹۳۲	۱,۶۲,۳۰۱	۸۰,۸۱۶	۱,۰۶,۲۴۸	۲۷,۸۰۸	۵۰,۰۰۸

حسبِ ذیل اعداد سے، زیرِ تبصرہ زمانے کی تعلیمی رفتار کا ایک اچھا خاکہ

ذہن نشین ہوسکیگا۔ یہ اعداد قیام جامعہ عثمانیہ سے پہلے تعلیمی رفتار کا خلاصہ ہیں ۔

سنہ	تعداد مدارس	تعداد طلبہ	مصارف سالانہ
سنہ ۱۳۱۶ف ۱۹۰۶-۷ء	۹۰۲	۵۹۵۲۱	۶۶۷۰۴۸ روپیہ
۱۳۱۷	۹۳۰	۶۱۶۲۲	۱۲۴۸۹۴۰
۱۳۱۸	۹۶۰	۶۴۵۹۲	۱۲۴۸۹۴۰
۱۳۱۹	۱۰۳۴	۶۶۲۳۵	۱۳۷۵۵۰۰
۱۳۲۰	۱۰۳۶	۶۶۴۸۴	۱۳۹۹۸۵۳
۱۳۲۱	۱۰۵۲	۶۵۱۰۴	۱۵۳۱۵۰۳
۱۳۲۲	۲۰۹۶	۹۲۵۷۲	۱۵۹۹۵۵۸
۱۳۲۳	۱۱۶۰	۷۲۵۸۲	۱۷۸۸۵۲۰
۱۳۲۴	۱۱۶۹	۸۲۹۶۲	۲۰۲۳۷۵۲
۱۳۲۵	۱۲۵۴	۹۳۲۸۹	۲۱۹۲۹۹۸
سنہ ۱۳۲۶ف ۱۹۱۶-۱۷ء	۲۵۷۹	۱۴۰۶۷۳	۲۲۲۳۱۷۵

جامعہ کے قیام کے بعد

تعلیم کی رفتار میں سرعت محکمۂ تعلیمات کی مستعدی
فوقانی اور اعلیٰ تعلیم کے دو نظام۔ تحتانی تعلیم کی اصلاح
ابتدائی تعلیم مفت کر دی گئی۔ جسمانی تعلیم۔ جاگیردار
اسکول کا قیام۔ جامعۂ عثمانیہ کے قیام کا اثر نظام
کالج پر "انجمن اساتذہ حیدر آباد دکن" کی
خدمات۔ تعلیمی رسائل۔ علمی فضا کی تخلیق۔

جامعہ کے قیام کے بعد

علم کے کسی ایک شعبے یا درجے کی ترقی عموماً ملک کی عام علمی سطح کی بلندی کا سبب بن جاتی ہے ۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہی، ممالک محروسہ کے تعلیمی نظام کی اصلاح اور تعلیم کو ملک اور اہل ملک کے لئے زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کے مقصد سے عمل میں آیا تھا ۔ اِس لئے جامعہ کے قائم ہوتے ہی ملک کی تعلیمی رفتار میں سرعت کا پیدا ہو جانا، متوقع نتیجہ تھا ۔ چنانچہ جامعہ کے علمی شعبوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ ملک کی عام تعلیمی حالت بھی درست ہونے لگی ۔

جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے معاملے میں مزید خصوصیت یہ تھی کہ، ملک کے لئے اس طرح کے ایک علمی مرکز کی ضرورت کا احساس، عرصہ پہلے سے پیدا ہو چکا تھا جب اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی علم پرورانہ شفقت کے سبب اور متعدد تعلیمات کی عاجلانہ کارروائی کی بدولت، حیدرآباد کے لئے ایک اعلیٰ علمی مرکز مہیا ہو گیا، تو اہل ملک کے بیٹھے ہوئے حوصلے ایک دم اُبھر پڑے ۔ اور عرصہ دراز کے تشنگان علم

اس سلسبیل علوم و فنون کی طرف تیزگامی سے بڑھنے لگے۔ اس ذوق و شوق میں دارالعلوم کے تنزل اور جامعہ کے مرکز علمی کے افق نظر سے دور ہوجانے کے علاوہ خاص انگریزی تعلیم کے ہمت شکن نتائج کی وجہ سے اور بھی زیادتی ہوگئی۔ جامعہ کے اعلیٰ تعلیمی اور علمی نصب العین کا پیش نظر ہونا، طالبان علم کے آگے بڑھنے کے لئے کافی تحریک اور حوصلہ افزائی کا باعث ہوتا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے ساتھ ہی، عام تعلیمی رفتار میں جو سرعت پیدا ہوگئی ہے اس کا ایک سرسری اندازہ ذیل کے تختۂ مدارس و طلبہ سے ہوسکے گا:۔

سنہ	تعداد مدارس	تعداد طلبہ	مصارف سالانہ
سنہ ۱۳۲۶ف ۱۷-۱۹۱۶ء	۲۵۷۹	۱۴۰۶۷۳	۲۲۳۳۱۷۵
۱۳۲۷	۳۲۲۴	۱۸۲۹۸۷	۳۱۲۵۷۲۱
۱۳۲۸	۳۵۶۶	۱۸۵۹۲۹	۳۴۹۳۸۴۸
۱۳۲۹	۳۹۸۶	۲۱۶۵۸۳	۴۳۰۶۴۱۷
۱۳۳۰	۴۲۸۷	۲۳۴۵۰۳	۵۳۰۶۹۶۱
۱۳۳۱	۴۳۶۵	۲۴۷۲۲۸	۶۷۶۳۱۰۱
۱۳۳۲	۴۱۴۱	۲۹۱۱۲۱	۷۰۱۸۰۷۲
۱۳۳۳	۴۰۴۰	۲۴۲۳۹۸	۶۸۲۹۹۰۲
۱۳۳۴	۴۰۰۱	۲۴۴۲۴۳	۷۰۰۲۸۷۷

۱۳۳۵ف	۴۰۹۸	۲۵۸۲۹۸	۷۳۸۴۴۲۳
۱۳۳۶	۴۱۸۶	۲۳۷۱۵۷	۷۷۲۵۸۰۷
۱۳۳۷	۴۲۲۵	۲۸۱۲۹۴	۸۰۷۳۴۶۸
۱۳۳۸	۴۲۴۶	۲۹۱۱۸۰۰	۸۶۳۷۱۳۹
۱۳۳۹	۴۲۵۶	۲۹۱۹۳۰	۹۰۹۷۰۸۱
۱۳۴۰	۴۲۸۵	۲۹۹۹۶۳	۹۸۹۹۹۱۳
۱۳۴۱	۴۵۱۰	۳۱۵۴۸۷	۱۰۶۹۱۰۵۱
سنہ ۱۳۴۲ف ۱۹۲۳ء	۴۵۴۲	۳۲۷۰۶۷	۱۰۶۶۰۱۱۰

اوپر کے تختے سے ظاہر ہوگا کہ، جامعہ کے قیام کے سال یعنی سنہ ۱۹۱۷ء میں مدارس کی مجموعی تعداد (۲۵۷۹) اور طلبہ کی تعداد (۱۴۰۶۶۳) تھی۔ اِس تعداد میں خود اِس سال کا اضافہ مدارس کی حد تک نصف سے زیادہ، اور طلبہ میں، ایک ثلث کے قریب ہے۔ یہ اضافہ درحقیقت پچھلے کئی سال کے مجموعی اضافے کے مقابلے میں بھی زیادہ ہے۔

یہی حال جامعہ عثمانیہ کے پہلے امتحان میٹریکیولیشن کا بھی ہے۔ سنہ ۱۳۲۷ف کے اِمتحان عثمانیہ میٹرک میں، شرکاء کی تعداد ۱۲۱۵ تھی۔ حیدرآباد کی تاریخ میں سوائے مڈل کے، کسی اعلیٰ تر امتحان میں، امیدواروں کی اتنی تعداد اِس سے پہلے کبھی نہیں

شریک ہوئی تھی۔

سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

حقیقت میں یہ حیدرآباد کی آئندہ تعلیمی رفتار کی تمہید تھی۔ یہی رفتار ترقی سالہائے مابعد میں برابر قائم رہی چنانچہ عام تعلیم کے مدارس کی تعداد میں ہر سال سینکڑوں سے اور طلبہ میں ہزاروں سے برابر اضافہ ہوتا رہا۔ بالآخر یہ تعداد ۱۹۳۳ء میں (۴۷۵۳) مدارس اور (۲۲۷۰۶۷) طلبہ تک پہنچ گئی۔[1]
۱۳۴۲ ف

سررشتہ تعلیمات نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات کی قیادت اور سر حیدر نواز جنگ بہادر معتمد تعلیمات کی پشت پناہی میں "ہر قریہ کے لئے ایک مدرسہ" کے اصول کو اپنا مطمح نظر قرار دے لیا تھا اور اس پر وہ سرعت سے کاربند تھا۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد ہی محکمۂ تعلیمات نے ثانوی تعلیم کو جامعہ کی ضروریات کے مطابق بنانے کی مہم شروع کی۔ اور آخرکار پورے ثانوی نظام میں ترمیم اور اصلاح کر کے ان مدارج تعلیم کو ٹھیک کر لیا۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد بھی، چونکہ نظام کالج کو برقرار رکھنا حکومت کے منظور خاطر تھا، اس لئے، فوقانی تعلیم میں اگلی دورنگی باقی رہی۔ لیکن ۱۹۲۹ء میں محکمۂ تعلیمات اور جامعہ کے ذمہ وار عہدہ داروں نے باہمی مشورے سے یہ تصفیہ کیا

---

[1] ملاحظہ ہو رپورٹ نظم و نسق، سررشتہ تعلیمات ۱۳۴۲ف۔

کہ ان دونوں نظامات میں سوائے ذریعہ تعلیم کے فرق کے باقی تمام امور یکساں کر دیئے جائیں۔ چنانچہ اس غرض سے ایک کمیٹی قائم کی گئی، جس کی کارروائیاں، عثمانیہ میٹریکیولیشن کی تعلیم کا دوران بیچ، ایس، یل، سی کے مماثل تین سال مقرر کرنے اور نصاب کو حتی الامکان ہم آہنگ بنانے پر ختم ہوئیں۔ اس تجویز کی بدولت، بعض مشکلات کا سدباب ہو گیا۔

تحتانی تعلیم کو زیادہ مفید بنانے اور لازمی ابتدائی تعلیم کو ملک میں رائج کرنے کا بھی محکمۂ تعلیمات کو احساس ہوا۔ اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے سررشتہ کے ایک اعلیٰ عہدہ دار، میسور بھیجے گئے تاکہ وہ اس ملک میں لازمی ابتدائی تعلیم کے تمام اہم خدوخال پر غور کر کے کیفیت پیش کریں۔ دوسرے افسر ریاست ٹراونکور اور کوچن کے تعلیمی نظامات اور تعلیمی ترقی کے اسباب کا مطالعہ کر کے محکمہ میں رپورٹ پیش کرنے کے لئے، ان مقامات کو روانہ کئے گئے۔ مزید دو عہدہ داران تعلیمات امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس منعقدۂ لندن (۱۹۲۶ء) کی شرکت کے سلسلہ میں اس مقصد سے بھی یورپ بھیجے گئے کہ برّاعظم کی عام تعلیم کا مطالعہ کر کے سررشتہ کی ترقی میں اعانت کا باعث ہوں خود ناظم تعلیمات نواب مسعود جنگ بہادر نے، چھ ماہ کے لئے جاپان جیسے دور دراز مقام کا سفر اختیار کیا تاکہ اس ملک کی تعلیمی ترقی کے اسباب کا مطالعہ کریں۔ اور ممالک محروسہ کی تعلیمی ترقی کے لئے حتی الامکان ان اسباب اور ذریعوں سے مدد لے سکیں۔

موجودہ زمانے میں ہندوستان کے لئے محض نظری تعلیم کو مکتفی خیال کرنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ سررشتہ نے، اس ضرورت کو محسوس کرکے مدرسۂ فوقانیہ انگریزی بلدہ اور مدرسۂ فوقانیہ چادرگھاٹ میں تجارت کی تعلیم کے لئے جماعتیں کھولیں اور ۱۳۳۶ف ۱۹۲۷ء سے مدارس میں دستکاری اور صنعت گری کی تعلیم کا بھی آغاز کیا۔ اس سے پیشہ ور طبقوں میں اپنی اولاد کو تعلیم دلانے کی ترغیب ہو رہی ہے۔ دوسری طرف یہ پیشے جو ملک میں حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، آہستہ آہستہ وقیع بنتے جارہے ہیں۔ اس خصوص میں موجودہ ناظم تعلیمات جناب خان فضل محمد خاں کی دلچسپی کو بہت دخل ہے۔

اس زمانے کی اہم ترین تعلیمی اصلاح اعلیٰحضرت حضور پرنور کا وہ فرمان ہے جس کی رو سے عام ابتدائی تعلیم مفت کردی گئی ہے (۱۳۳۱ف ۱۹۲۲ء) اس ضروری اصلاح کے مستحسن نتائج ملک میں روزبروز ظاہر ہو رہے ہیں

موجودہ تعلیمی نظام میں جسمانی تربیت کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے مد نظر حکومت سرکار عالی نے ۱۳۳۵ف ۱۹۲۵ء میں، ایک ناظم بائے اسکوٹس کا تقرر کیا۔ اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک ماہر تربیت جسمانی مسٹر ویبر کا تقرر ہوا مسٹر ویبر ناظم تربیت جسمانی کی حیثیت سے ملک کے لئے مفید ثابت ہوئے۔ ان کے ماتحت ایک کلیہ تربیت جسمانی قائم ہے جس سے ہر سال بیسیوں فارغ التحصیل نکلکر، نونہالان ملک کی جسمانی حالت سنوارنے، اُن کی زندگیوں کو زیادہ معتدل بنانے اور اُن کے قویٰ کو،

دماغی محنت کے سبب مضمحل ہونے سے روکنے میں محکمۂ تعلیمات کی بڑی مدد کر رہے ہیں
اکثر مدارس میں اس کلیہ کے فارغ التحصیل، تربیت جسمانی کی خدمت پر مامور ہیں
مدارس نسواں کو بھی اس تحریک سے بہرہ ملا چنانچہ سررشتہ نے لڑکیوں کی تربیت
جسمانی کے لئے مسز ویبر کا تقرر کیا۔

ہر ملک میں، زمیندار اور جاگیردار طبقہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سرزمین
وطن کے ساتھ اس طبقے کی دلچسپیاں ناقابل انقطاع ہوتی ہیں۔ اسی لئے ملک کی
خوش حالی کا بہت کچھ انحصار، اس طبقے کی روشن خیالی پر ہے۔ آصف جاہی
خاندان کے حکمران، ہمیشہ اس گروہ کو روشن خیال بنانے کے ساعی رہے۔ چنانچہ ابتدا سے
لے کر آج تک اس طبقے کی تعلیم کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ مدرسہ عالیہ، مدرسہ اعزہ
مدرسہ سرداران وغیرہ، اسی سعی کا نتیجہ ہے۔ اس کے باوجود حال تک، حیدرآباد میں
عام جاگیرداروں کی اولاد کی تعلیمی حالت کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں تھی۔ اعلیحضرت سلطان العلوم
نے اس کو محسوس فرمایا۔ اور ۱۹۲۳ء (۱۳۳۲ف) میں، جاگیرداروں کی تعلیم کے لئے، ایک مدرسہ
قائم کرنے کا حکم نافذ فرمایا۔ جس کے اتباع میں "جاگیردار اسکول" قائم کیا گیا۔ یہ مدرسہ
ملک میں جدید مغربی طرز کی تربیت کا اچھا نمونہ ہے۔ بیگم پیٹھ نواح بلدہ میں طلبہ کی بود و باش کا
انتظام بآئین شائستہ کیا گیا ہے۔ اور قابل اور تجربہ کار معلمین کے ہاتھوں میں مدرسہ کا
نظم و نسق ہے۔ تعلیم کے علاوہ طلبہ کے اخلاق پر بھی خاص نگرانی رکھی جاتی ہے۔ اب تک
اس مدرسہ کو جاگیردار طبقہ میں روشن خیالی پھیلانے میں خاصی کامیابی ہوئی ہے۔

اور توقع ہے کہ اس اہم طبقے کی روشن خیالی سے ملک کو خاطر خواہ فائدہ پہنچے گا۔

حال ہی میں محکمۂ تعلیمات نے ایک نئے تعلیمی تجربہ کی ابتدا کی ہے یہ ماڈل پرائمری اسکول کا قیام ہے جس میں عام مدرسوں کے خلاف، لڑکے اور لڑکیاں ایک جا تعلیم پاتی ہیں۔ ہندوستان کی حد تک یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے، اس کے نتائج فوری برآمد ہونے کی توقع نہیں۔

مذکورۂ بالا تعلیمی اصلاحیں اور ترقیاں سولہ سترہ سال کی قلیل مدت میں ظہور پذیر ہوئیں۔ اس مدت کے ابتدائی (۱۱) سال تک نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات رہے۔ ۱۳۴۷ف ۱۹۲۸ء میں موصوف اس خدمت سے سبکدوش ہو کر، برطانوی ہند واپس گئے اور نظامت پر خان فضل محمد خاں صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔ جنہوں نے نہ صرف اپنے پیش رو کی روایات توسیع تعلیم کو برقرار رکھا، بلکہ، پیشہ ورانہ تعلیم کی ترویج سے تعلیم کو زیادہ مفید اور سودمند بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ملک کے قدیم ترادارے، نظام کالج کے لئے بھی یہ جدید عہد بہت مبارک ثابت ہوا۔ اہل ملک میں بڑھتے ہوئے تعلیمی شوق کا یہ لازمی نتیجہ ہونا چاہئے تھا چنانچہ یہ ادارہ جو کبھی قلتِ طلبہ کے سبب ہمیشہ بار گراں بنا رہا۔ گزشتہ سال سے طلباء کی شرکت کو محدود کر دینے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اس کے متعلمین کی تعداد جو پہلے مشکل سے سو سوا سو کے قریب پہنچتی تھی، جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے دو تین سال بعد وہ دو سو کے قریب پہنچ گئی، اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے تین سو سے بھی بڑھ گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ

یہ تعداد جامعۂ عثمانیہ کے صرف مرکزی کالج کے مقابلے میں نصف سے بھی کم ہے لیکن خود اس کالج کی گزشتہ تعدادوں کے مقابلے میں سہ گنی ہوتی ہے۔

ذیل میں نظام کالج کے طلبہ کی سنہ وار تعداد کا تختہ درج ہے۔

سنہ	تعدادِ طلبہ	سنہ	تعدادِ طلبہ
۱۳۲۷ف	۱۹۰	۱۳۳۴ف	۲۷۰
۱۳۲۸	۱۵۱	۱۳۳۵	۲۷۰
۱۳۲۹	۱۳۷	۱۳۳۶	۲۸۵
۱۳۳۰	۱۸۱	۱۳۳۷	۲۹۹
۱۳۳۱	۱۹۹	۱۳۳۸	۲۸۷
۱۳۳۲	۲۲۱	۱۳۳۹	۳۰۹
۱۳۳۳	۲۶۱		

جامعۂ عثمانیہ کے اوّلین اور مرکزی کالج یعنی یونیورسٹی کالج کا افتتاح ۱۹۱۹ء / ۱۳۲۸ف میں ہوا۔ اِس سال صرف سال اول کی جماعت کھلی تھی جس میں (۱۲۹) طلبہ شریک تھے۔ بعد کے چھ سال تک جیسی جیسی اوپر کی جماعتیں قائم ہوتی گئیں، طلبہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ سنہ ۱۹۲۴ء / ۱۳۳۳ف میں کالج کی پوری جماعتیں مکمل ہوگئیں۔ اس سال طلبہ کی تعداد (۵۶۷) تھی۔ اِس میں دوسرے کالجوں کی تعداد شامل نہیں ہے جو اس دوران میں قائم ہوگئے

سنہ ۱۳۲۸ف سے سنہ ۱۳۴۳ف تک جامعۂ عثمانیہ کے تمام کالجوں میں طلبہ کی جس قدر تعداد زیر تعلیم تھی۔ اُس کا تختہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

سنہ	تعدادِ طلبہ	سنہ	تعدادِ طلبہ
سنہ ۱۳۲۸ف	۱۲۹	سنہ ۱۳۳۶ف	۹۸۷
۱۳۲۹	۲۲۷	۱۳۳۷	۸۲۵
۱۳۳۰	۲۰۳	۱۳۳۸	۷۳۸
۱۳۳۱	۲۹۵	۱۳۳۹	۸۷۰
۱۳۳۲	۴۸۵	۱۳۴۰	۸۸۴
۱۳۳۳	۶۹۷	۱۳۴۱	۱۰۹۵
۱۳۳۴	۷۲۰	۱۳۴۲	۱۱۴۴
۱۳۳۵	۷۶۰	سنہ ۱۳۴۳	۱۲۵۰

جامعۂ عثمانیہ کے قیام سے پہلے، حیدرآباد جیسی وسیع ریاست میں مغربی اور انگریزی تعلیم یافتہ اشخاص کی تعداد، اتنی تھوڑی تھی کہ انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی طیلسانی بمشکل سے سَو سوا سو ہوں گے۔ مابعد طیلسانی ڈگریاں تو بڑی چیز تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ کئی سال پہلے سے نظام کالج قائم تھا۔ لیکن اس کا دامن ایک ایسی مادرِ علمی کے ساتھ بندھا ہوا تھا جو عرصہ سے تعلیمی ضبط تولید کے اصول پر کاربند ہے

اِس لئے سال بھر میں مشکل سے دو چار طیلسانی، نظام کالج کی قسمت سے پیدا ہو جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعداد ملک کی ضرورتوں کے لحاظ سے بہت ناکافی تھی۔ یہ فارغ التحصیل جلد ہی کسی نفع رساں سررشتہ میں جذب ہو جاتے تعلیمات جیسے خشک سررشتہ میں کون آنا چاہتا؟ اِس لئے حکومت کے ایسے سررشتوں میں مدراس اور شمالی ہند کے تعلیم یافتوں کے لئے کافی گنجائش تھی۔ حکومت کو اکثر عہدہ دار برطانوی ہند سے مستعار لینے کی ضرورت لاحق ہوتی رہتی تھی۔ ایسی فضا میں ٹھیٹ علمی، ادبی یا تحقیقی کام کرنے والوں کا پیدا ہونا، تقدیر ہی کے ہاتھ تھا۔

دارالعلوم کے فارغ التحصیل، اپنے میدان عمل میں سرگرم کار تھے اور ان کی وجہ سے ملک میں علمی چہل پہل ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن ملک کی ضرورتیں اس سے زیادہ وسیع تھیں جو یہ چند تعلیم یافتہ حضرات پوری کر سکتے۔ پھر جدید شایستگی کے تخیل سے عوام اور خواص اس قدر مرعوب تھے کہ، ٹھیٹ مشرقی تعلیم یافتہ اس وقعت کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے، جس کے وہ مستحق تھے۔ اِس میں شک نہیں کہ انفرادی سعی سے، ان بزرگوں نے اپنے آپ کو تبدیل شدہ فضا کے مطابق بنانے میں جو کامیابی حاصل کی، وہ بہرحال قابل تعریف ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ "دارالعلوم" کے تعلیم یافتہ انگریزی سے ناواقفیت کو خود محسوس کرنے لگے تھے۔ چنانچہ انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم" کے تحت انہوں نے انگریزی زبان کی تعلیم کے لئے جو نائٹ کلاس قائم کی تھی، ان کے اِس احساس کا ثبوت ہے۔

جامعہ عثمانیہ کی برکتوں نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ اس وقت ملک کی خدمت گزاری کے لئے، تربیت یافتہ نوجوانوں کی ایک وافر تعداد یہاں موجود ہے۔ یہ حقیقت وہ عظیم الشان خدمت ہے، جو کوئی ادارہ اپنے ملک کی کر سکتا ہے۔ جامعہ کا پہلا امتحان بی، اے ۱۹۲۱ء ۱۳۴۱ف میں منعقد ہوا۔ تیرہ سال کے عرصے میں تقریباً ایک ہزار طیلسانی ملک کی خدمت کے لئے جامعہ نے پیدا کئے۔ ان میں ایک سو کے قریب ام، اے۔ اور تین چار سو کے قریب گریجویٹ ہیں۔ اور خدا کے فضل سے زندگی کے ہر شعبہ اور ہر محکمہ میں یہ کام کر رہے ہیں۔

ملک کی چاروں سمتوں میں انٹرمیڈیٹ کالجوں کے قیام سے، اضلاع میں اعلیٰ تعلیم کی جو سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں اُن کا اعادہ تحصیل حاصل ہے۔ فنی کالجوں کے قائم ہونے سے ملک کی عملی اور اہم ضرورتیں رفع ہونے کا سامان بھی مہیا ہوتا جا رہا ہے ایک چیز جو کسی باہر سے آنے والے کو خاص طور پر متاثر کرتی ہے، وہ جامعہ عثمانیہ کے تمام شعبوں اور کالجوں کے اکثر اساتذہ، اور طلبہ کے جذبات ہیں۔ یہ خدمت گزاران علم، اپنے نصب العین کو کامیاب بنانے میں اسی جوش اور عقیدت مندی سے کام کر رہے ہیں، جو ایک بت کے پجاری کے شایان شان ہے۔

عام تعلیم کے اس مرحلہ پر پہنچنے کے ساتھ ہی، ترقی پذیر اور زندہ معاشرہ فطرتاً دائیں، بائیں اور آگے کو راستے ڈھونڈنے لگتی ہے۔ اسی تقاضائے فطرت کی بدولت، حیدرآباد میں اعلیٰ علمی، ادبی اور تحقیقاتی کارناموں کا پیدا ہونا آسان ہو گیا

ہے۔ ادب، سائنس، ریاضی، تاریخ، فلسفہ، طب، انجنیری غرض علم و فن کے اکثر شعبوں میں مستند تحقیقی کام کرنے والے اس وقت حیدرآباد میں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اور برابر علم و ادب کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں۔

جامعہ کے قیام کے زمانے ہی سے سررشتۂ تعلیمات کو معلمین کی قابلیتوں کے معیار کو بڑھانے، اور مدارس کے پایۂ تدریس کو باضابطہ تعلیم پائے ہوئے، اور فنّی تربیت یافتہ اساتذہ کے تقرر سے بلند کرنے کا خیال شدت کے ساتھ پیدا ہوا۔ اس کام کو بھی نظماء تعلیمات نے ایک مہم کے طور پر جاری رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت ممالک محروسہ سرکار عالی کا محکمۂ تعلیم قابل اساتذہ کے لحاظ سے ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے سے کم نہیں ہے۔ ان تربیت یافتہ اساتذہ میں، ایک خاصی تعداد انگلستان کی مستند جامعات جیسے جامعہ لیڈز اور جامعہ لنڈن کے فارغ التحصیل حضرات کی موجود ہے۔ جن کے ہاتھ میں کوئی ملک بھی اپنے نونہالوں کی تربیت نہایت اطمینان کے ساتھ سونپ سکتا ہے۔

موجودہ عصر کی تعلیمی چہل پہل میں چند اداروں کی مساعی اور کچھ انفرادی کوششوں کو بھی دخل ہے۔ اداروں میں سب سے اہم "انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن" ہے جس کی طرف پچھلے کسی باب میں اشارہ کیا گیا ہے۔ "انجمن اساتذہ" ہندوستان کے اُن چند خصوصی اور فنّی اداروں میں سے ایک ادارہ ہے، جس کی کارگزاریوں نے اس کو بہت جلد باوقعت بنا دیا ہے۔ اس انجمن کا نظم و نسق ایسے ماہرین تعلیم کے

ہاتھوں میں ہے جو اپنے طویل تجربے اور ذاتی قابلیت کی بدولت خاص رتبہ رکھتے ہیں۔ اس انجمن کی بدولت ملک میں بہت کچھ ٹھیٹ تعلیمی کام انجام پا رہا ہے۔ اسکی وجہ سے جدید ترین فنی معلومات دور دراز تعلقات کے مُدرسین کی دسترس میں آگئی ہیں۔ انجمن نہایت پابندی کے ساتھ اپنے سالانہ اجلاس منعقد کرتی ہے جسمیں تعلیمی مسائل پر تقریریں ہوتی ہیں۔ اِس نے ملک کے تعلیمی اُمور پر غور کرنے کے لئے اب تک جتنی ذیلی مجلسیں مقرر کیں، اُن کے مشوروں سے سررشتہ تعلیمات کو بڑی مدد ملی۔ عوام اور تعلیمی خدمت گزاروں میں تعلیم کے متعلق سنجیدہ خیالات پیدا کرنے میں اِس انجمن کی مساعی بے حد مشکور ہوئیں۔

انجمن کی سرپرستی میں ایک سہ ماہی رسالہ "حیدرآباد ٹیچر" بھی جاری ہے جو انگریزی اور اُردو پر مشتمل ہے حصّۂ انگریزی کے مدیر مسٹر علی اکبر صدر مہتمم تعلیمات حلقۂ بلدہ و اطراف بلدہ ہیں حصّۂ اُردو کی ادارت مولوی عبدالنور صدیقی کے تفویض ہے۔ یہ خصوصی تعلیمی رسالہ ہے جو اِس پیشہ کی معلومات اور خدمت گزاروں کے درمیان رابطہ کا کام کر رہا ہے۔

"حیدرآباد ٹیچر" کے علاوہ ایک قدیم تر اور اہم رسالہ "المعلم" ہے جو ۱۹۱۴ء میں جاری ہُوا۔ اِس کے پہلے مدیر مولوی محمد حسین صاحب جعفری موجودہ نائب ناظم تعلیمات تھے۔ اب مُولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج، اِس خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔ مرحوم عظمت اللہ خاں صاحب بھی جو اُردو کے مشہور شاعر اور اچھے

ادیب تھے اس رسالہ کے شریک مدیر رہ چکے ہیں۔"المعلم" بھی خصوصی تعلیمی رسالہ ہے اور اس فن کے رسالوں کی صفِ اول میں شمار ہوتا ہے۔ اُردو کے بہت کم رسالے اس پابندی سے شائع ہوتے ہوں گے۔

اس موضوع سے متعلق ایک اور رسالہ"متعلم" بھی چند سال پہلے مولوی حفیظ اللہ صاحب کی ادارت میں جاری ہوا تھا طالب علموں کی دلچسپی کے مضامین اس میں شائع ہوتے تھے۔ چند اشاعتوں کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔ اس سلسلہ میں دو قدیم تر رسالوں کا ذکر بھی ضروری ہے، جو خصوصی تعلیمی رسالے تو نہیں ہیں لیکن ان سے کم سن طلبہ کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان میں پہلا رسالہ" ادیب الاطفال" ۱۹۰۷ء میں میں جاری ہوا تھا۔ اس کے مدیر احمد اللہ بیگ صاحب اور نائب مدیر مسٹر رگھوناتھ راؤ درد تھے۔ دوسرا رسالہ" نونہال" کوئی پندرہ سال پہلے مولوی مرغوب الدین صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ کئی سال تک جاری رہا۔ اب چند سال سے یہ بند ہو گیا ہے۔

موجودہ حیدرآباد کا ربع صدی پہلے کے حیدرآباد سے مقابلہ کیجئے تو تو ایک جہان کا تفاوت نظر آئے گا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ خود ملک کا جدید نظم و نسق چلانے کے لئے انگریزی تعلیم یافتہ افراد کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اور اسی لئے سر سالار جنگ مرحوم کو، جن کے عہد میں جدید نظم و نسق رائج ہوا، حکومت ہند سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔ آج حیدرآباد اپنے قابل فرزندوں کے ذریعہ، نہ صرف ملک، بلکہ برطانوی ہند کی خدمت کرنے تیار ہے اور کچھ نہ کچھ خدمت انجام

دے رہا ہے۔ اِس مملکت کے عہد گزشتہ کے بعض مخصوص خد وخال، آج تمدن اور شائستگی کا لازمہ نظر آ رہے ہیں ۔

علم شائستگی کی کنجی ہے جس قوم اور جس ملک کو یہ ہاتھ آجائے، تہذیب اور شائستگی کے تمام باب رفتہ رفتہ وا ہونے لگتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی حکیمانہ نظر نے ملک کی اصلی ضرورت کو جانچ کر ایک ایسا عطیہ مرحمت کیا، جس کا فیض نسلوں تک جاری رہے گا۔ موجودہ علمی اور تعلیمی ترقیوں کا اثر ملک کی فضا پر جن جن زاویوں سے پڑ رہا ہے، اُس کی تفصیل ایک مستقل کتاب چاہتی ہے مختصر یہ کہ حیدرآباد میں جدید شائستگی کی کرن طلوع ہو چکی ہے، اور قدیم فضا بیدار ہو کر سرگرم عمل ہو گئی ہے۔ زندگی کی یہ لہر جو شدت میں ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے سے کم نہیں ہے، فرخندہ بنیاد کی رونق اور چہل پہل کا باعث بن رہی ہے۔ حیدرآباد کی علمی تاریخ کا یہ دور گزشتہ تمام دوروں کے مقابلے میں بہت زیادہ درخشاں اور بہت زیادہ اثر آفریں ہے ۔

اِشاریہ

اشاریہ

آ

الف

ف

ق

ک

مصنف کی دوسری کتابیں

۱۔ دنیائے افسانہ۔ افسانوں، ناول اور مختصر قصوں کے فن اور اردو قصہ نگاری کی تاریخ پر اردو میں سب سے پہلی اور واحد کتاب، جو اس فن سے متعلق تمام ضروری مباحث پر حاوی ہے بعض جامعات کے نصاب میں بھی داخل ہے۔ دوسرا اڈیشن ضروری اور مفید اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ ہر قصہ نگار اور قصہ خواں کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

قیمت .... عہ

۲۔ کردار اور افسانہ۔ افسانوں میں اشخاص قصہ اور کردار، ان کی اقسام، ان کی اہمیت اور اچھے اشخاص قصہ اور کردار پیدا کرنے کے رازوں اور دوسری متعلقہ بحثوں پر مشتمل ہے۔ آخر میں اردو کے بعض مشہور قصوں کے بہترین کرداروں پر ان اصولوں کی روشنی میں تنقید کی گئی ہے۔ یہ بھی اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ قیمت .... عہ

۳۔ دنیا کے شاہکار افسانے۔ یہ سلسلہ چودہ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں دنیا کی تمام ادبی زبانوں کے مشہور مختصر قصے تاریخی ترتیب میں جمع کیے گئے ہیں۔ ابتدا میں مصنف کے حالات اور تصنیفات کا بھی ذکر ہے۔ اس کے حسب ذیل حصے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ قدیم افسانے۔ جو قدیم مصر، یونان، عرب، ایران اور ہندوستان کے ادبی قصوں پر مشتمل ہے۔ قیمت .... عہ

۲۔ چینی اور جاپانی قصے۔ ان ممالک کے بہترین قصوں کا اردو میں اولین مجموعہ

قصے ایسے دلچسپ ہیں کہ کتاب ختم ہونے تک ہاتھ سے نہیں چھوٹتی قیمت ۱۰/

۳۔ انگریزی قصے۔ انگلستان کی بہترین کاوشوں کا مجموعہ قیمت عہ

۴۔ فرانسیسی افسانے۔ دنیا کے بہترین مختصر قصوں میں سب سے زیادہ اہمیت فرانسیسی افسانہ نگاروں کو حاصل ہے۔ قیمت .... عہ

۵۔ اردو قصہ نگاری کی تاریخ۔ یہ کتاب اردو افسانوں کی عہد بہ عہد تاریخ اور تاریخ ادب اردو میں ایک اہم اضافہ ہے۔ .... زیر طبع

۶۔ جدید اردو شاعری۔ حالی کے بعد اردو شاعری میں جو انقلاب رونما ہوا اسکی عہد بہ عہد تاریخ، موجودہ زمانے کے شعرا، اُن کے حالات اور اُن کے کارناموں کا مفصل بیان اور جدید شعرا کے کلام کا بہترین انتخاب ہے متعلمین ادب کے لئے جدید شاعری پر اس سے زیادہ مفید کتاب آج تک نہیں لکھی گئی قیمت .... عہ ۸/

ملنے کا پتہ

مکتبہ ابراہیمیہ محی الدین بلڈنگ عابد روڈ حیدرآباد دکن